کی کمیٹی اصلاح رسم الخط نے املا کے بارے میں سفارشات پیش کی تھیں اب مرکزی حکومت
نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے اس نے اور امور کے ساتھ اس جانب
بھی دھیان دیا ہے اور اس کے لیے ایک سہ نفری کمیٹی تشکیل کی ہے۔ . . . . .
چنانچہ کمیٹی کے ایک لائق رکن رشید حسن خان صاحب نے اردو املا کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔
اور دوسرے لائق رکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات و اصلاحات کو اس کتاب
میں مرتب کیا ہے، اس میں اردو املا کے مختلف النوع مسائل کے متعلق سفارشات درج ہیں، مثلاً عربی
فارسی اور دوسری زبانوں کے جو الفاظ اردو میں رائج ہیں انکے املا میں اصل کی پیروی کی جائے یا اردو کے مروج
طریقہ کو قائم رکھا جائے، اسی طرح جو الفاظ نون سے لکھے تو جاتے ہیں مگر پڑھے میم سے جاتے ہیں جیسے گنبد وغیرہ انکے بارے
میں املا کے کیا قاعدے ہونے چاہئیں یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل میں املا کو متعین کرنے کیلئے کمیٹی نے جو سفارشات پیش
کی ہیں یہ کتاب انکا مجموعہ ہے اسمیں متعدد حروف الف، تنوین، ت، ۃ، ط، ذ، ز، ژ، س، ص، نون، نون غنہ، یائے
مختفی، ہائے مخلوط، ہمزہ، ترکیب ہوئے الفاظ اور بعض اعداد وغیرہ کے املا کی بے اعتدالی اور انتشار کو دور کرنے کیلئے اصلاحات
بھی تجویز کی گئی ہیں اور لفظوں کے درمیان فاصلہ اور انکو ملا کر لکھنے کے قاعدے، اعراب، علامت اور رموز اوقاف وغیرہ کے
بارے میں بھی ہدایتیں دی گئی ہیں، عموماً اس کمیٹی نے انہی سفارشات کو برقرار رکھا ہے جنکو انجمن کی کمیٹی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
مرحوم نے پہلے تجویز کیا تھا مگر بعض مقامات پر اختلاف بھی کیا گیا ہے اور بقول ڈاکٹر عبدالعلیم صدر ترقی اردو بورڈ ان
سفارشات میں قدیم علم اور جدید صوتیات دونوں کے تقاضوں کو نظر میں رکھکر بنیادی اصولوں کی وضاحت
صاف اور سلیس طور پر کی گئی ہے، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے مختصر مگر جامع، مفید اور لائق مطالعہ ایک مقدمہ بھی
ہے املا میں اصلاح و یکسانیت کی کوشش ایک مفید اور ضروری اقدام ہے اسکا خیر مقدم کیا جانا چاہئے لیکن ایسے ضروری
اور اہم مسئلہ میں مزید غور و فکر اور اردو لسانیات کے ماہرین اور ہر طبقہ کے ممتاز اہل علم کے خیالات معلوم کرنا بھی ضروری ہے، ایسی
اہم کتاب میں کتابت کی غلطیوں کا پایا جانا افسوسناک ہے، ص ۳۰ پر مولا کو ان الفاظ کی فہرست میں دیا گیا ہے جنکے متعلق لکھا گیا ہے کہ
یہ پہلے ہی سے معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں مگر اسکے بعد ہی اسکو ان الفاظ میں بھی شامل کر دیا گیا ہے جنکا املا دونوں طرح رائج ہے
یعنی مولا اور مولیٰ. ظاہر ہے ان میں سے کوئی ایک ہی بات صحیح ہوگی۔

"ض"

جلد ۱۱۵ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۵ء عدد ۲

مضامین

شذرات

جناب شاہ صاحب کی اچانک رحلت سے دارالمصنفین کی فضا اب تک سوگوار ہے، اُن کو بھلایا نہیں جاتا، اُن کی کسی چیز پر نظر پڑ جاتی ہے تو

ع دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

اُن کے ساتھ چالیس سال تک جتنے کیف آگیں دن گذرے اب اسی کی یاد اندوہگیں بنی ہوئی ہے،

اُن کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے   جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

بارالٰہا! اُن کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے معمور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما، آمین،

اسی مہینہ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی دارالمصنفین میں قیام کے لئے تشریف لے آئے ہیں، اُن کی آمد سے یہاں کی سوگواری میں نہ صرف کمی پیدا ہو جائیگی، بلکہ اُن کے علم و فضل سے پورا فیض اٹھانے کا موقع ملے گا، وہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز شاگرد رہ چکے ہیں، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک عرصہ سے مدرس رہنے کے بعد جامعہ ملیہ، نئی دہلی میں دینیات اور تاریخ اسلام کے استاد بھی رہے، جہاں اپنی نیکی، پرہیزگاری، اخلاص مندی اور فرض شناسی کی وجہ سے مقبول تھے، ڈاکٹر عابد حسین کے ادارہ اسلام اور عصر جدید کے سہ ماہی رسالہ کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں، اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی ہیں، اس سال سے پہلے حج کے موقع پر شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ وہ بھی سعودی عرب کے امیر فیصل کی طرف سے زیارت خانہ کعبہ کے لئے مدعو تھے، اور دونوں ہم سفر بھی رہے، شگفتہ اور باوزن تحریر لکھنے میں دبستانِ شبلی ہی کے مقلد ہیں، دارالمصنفین سے اُن کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئی ہیں، اُن کی تشریف آوری سے ہمارے رفقاء کار خوش ہیں، ہم بھی یہ کہکر اپنے دیدۂ و دل سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، ع تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں،

دارالمصنفین کو قائم ہوئے اب ساٹھ سال ہو رہے ہیں، اس کے اسلاف اور اُن کے اخلاف نے جو کچھ کیا، اس کو مولانا جامی کی ایک تمثیل میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب انھوں نے خاقانی کے ایک

مشہور قصیدہ کی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر طبع آزمائی کی جس میں امیر خسرو بھی اپنے فن کا کمال دکھا چکے تھے، تو اپنا قصیدہ ختم کر کے لکھا کہ خاقانی نے خوانِ نعمت بچھایا، امیر خسرو نے اس کو نمک ڈال کر بامزہ بنایا، مگر خود انھوں نے کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلوا دیئے، اسی طرح علامہ شبلی نے جو خوانِ نعمت بچھایا تھا، اس کو اُن کے نامور شاگردوں نے سجایا، ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے اس خوان پر کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلانے کا فرض انجام دیا، مگر اب یہ ہاتھ دھلانے والے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں،

ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں شبلی، سلیمان، اسلام اور مسعود نہیں پیدا ہو سکتے، مگر اُن کا کام ایک پوری جماعت کے ذریعہ سے انجام پا سکتا ہے، جو زیادہ سے زیادہ با صلاحیت افراد کے جمع کرنے کے بعد ہی بنائی جا سکتی ہے، مگر اس کی تشکیل کے مادی وسائل کی فراہمی کے سوال پر ہر طرف سے یہ خاموش آواز سنائی دیتی ہے ع داغِ لالہ کیلئے کیا فکرِ مرہم کیجئے

دارالمصنفین کے اسلاف نے جس ایثار کے ساتھ اس کی خدمت کی، اس کی قدر اُن کی زندگی میں نہیں بلکہ اُن کے بعد ہوئی، اسی طرح دارالمصنفین کے شاہ صاحب کے بعد ہی اُس کے کارناموں کی مشعل روشن کر کے اس کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا،

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہئے،

اس ادارہ میں برسوں خونِ جگر پی پی کر ایک کتاب تیار کی جاتی ہے، اُس کی اشاعت پر علمی حلقوں میں تو مدح و تحسین کے پھول برسائے جاتے ہیں، مگر یہ گودام میں برسوں کیا قرنوں پڑی رہتی ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا، کہ "دارالمصنفین کے قدر دانوں، معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے، کہ قدردانی، تعریف، اور شکر گذاری اپنی جگہ پر اچھی چیزیں ہیں، لیکن اُن سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالم مادی میں دینی اور روحانی کاموں کے لئے بھی مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دارالمصنفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کے لئے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے، "

فرض کفایہ ہی نہیں بلکہ فرض ذاتی ہو کہ قدموں اور سخنے سے آگے بڑھکر دامے درمے اسکی دل کھول کر مدد کریں، اگر حضرت مرحوم کی مراد دامے درمے سے عطیات اور چندوں کے بجائے یہ بھی تھی کہ اس کی مطبوعات کے خریدار زیادہ سے زیادہ ہوں، بقول اُن کے "یہ کوئی احسان نہیں ہوگا، بلکہ ایک سودا جس میں چاندی کے چند ٹکوں، بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم وحکمت کی دولت ہاتھ آئے گی، جو بے بہا اور لازوال ہے"

اس اپیل کی خاطر خواہ سماعت نہیں ہوئی تو پھر میری آہ کو بھی اثر ہونے کے لئے ایک عمر چاہئے، لیکن میرے بے مہر کہنے سے کوئی مہربان کیوں ہو، دارالمصنفین کی بزم کے آشفتہ سروں کو تشنہ کامی رہ کر اس کے مقصد کی تکمیل میں استواری دکھائی ہے، اور جب اس کے لئے ترکِ وفا کا سوال ہی نہ ہو تو چارہ ساز اور غم گسار نہ سہی، ع :-

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

دارالمصنفین کے بچھڑے ہوئے علمی کاموں میں ابھی طباعت واشاعت کے لئے حسب ذیل مسودے تیار ہیں، (۱-۲) مقالات سلیمان جلد چہارم و پنجم (۳) مقالات عبدالسلام جلد دوم (۴) تذکرۃ المحدثین جلد دوم (۵) تبع تابعین جلد دوم، (۶) محمود غزنوی (۷) بزم تیموریہ جلد دوم (۸-۹) غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد اول و دوم (۱۰) ہندوستان کے عہدِ مغلیہ سے پہلے کے مسلمان فرمانرواؤں کی مذہبی رواداری (۱۱) شاہانِ مغلیہ کی مذہبی رواداری (۱۲) فارسی میں نعت گوئی (۱۳) مولانا محمد علی کی یاد میں، (۱۴) علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی وادبی خدمات (۱۵) خریطۂ جواہر،

یہاں سے ہر سال دو تین کتابوں کی طباعت واشاعت کی روایت رہی ہے اس طرح صبر آزما حالات کی ناسازگاری کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ابھی آیندہ چھ سات سال تک اس کی علمی روایات میں کمی نہ آئے گی، ع :

نقش پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

مقالات

ہندوستان کے عہدِ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ مقالہ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کے ایک جلسہ میں، ۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے الماطیفی ہال میں پڑھا گیا، جلسہ کے صدر ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت مہاراشٹر تھے، جلسہ میں وقت کی قلت کے سبب مقالہ کے کچھ حصے چھوڑ چھوڑ کر پڑھے گئے، اب مزید اضافہ کر کے معارف میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمہید اس مقالہ کا موضوع "ہندوستان کے عہد ماضی میں مذہبی رواداری" ہے، عہد ماضی سے مراد وہ دور ہے جبکہ اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت رہی، وہ یہاں آئے تو انکو یہاں کے ایسے باشندوں سے سابقہ پڑا جو انکے ہم مذہب نہ تھے، اس مقالہ میں یہ ظاہر کرنا ہو کہ ان دونوں مذاہب کے پیروؤں میں استیلا اور اقتدار کی خاطر صرف خونریزی اور غارتگری ہوتی رہی یا دونوں میں فراخ دلی، رواداری، بے تعصبی اور کشادہ دلی بھی رہی، تاریخ کے مواد کچے ہوتے ہیں، وہ دلوں کو توڑنے اور جوڑنے دونوں کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں، کسی ملک کے کسی دور کی صرف خونریزی اور ہولناکی کی داستانیں جمع کردی جائیں تو اسکی تاریخ یقیناً قصائی کی دوکان ہو جائیگی، لیکن اس عہد میں ایسے بہت کچھ مواد ملیں گے جن سے مہر و محبت کی داستانیں، دلجوئی اور دلنوازی کی حکایتیں قلمبند کیجائیں تو اسی عہد کی تاریخ دل آزار ہونے کے بجائے دلنواز بنجائے، مورخ کا قلم بھی عجیب ہوتا ہی، یہ شعلہ بھی ہو اور شبنم بھی، کانٹا بھی ہو پھول بھی، زہر بھی ہو تریاق بھی، پیار و چمکار بھی ہو تو نفرت وعداوت کی تلوار کی جھنکار بھی، یہ کلیجہ کو چھید کرکے لاعلاج ناسور بھی پیدا کرسکتا ہو تو دلوں کو سرور بھی بخش سکتا ہو، اس مقالہ میں شبنم، پھول، پیدا

اور سرور کی کہانیاں سنائی ہیں ۔

لڑائیوں کی سیہ کاریاں

یہ صحیح ہے کہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان کو بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں، ان لڑائیوں میں خوں ریزی بھی ہوئی، ان کی فوجوں نے بعض علاقوں میں غارتگری بھی کی، انھوں نے برسرپیکار باشندوں کے لیے سخت، نامناسب اور تکلیف دہ کلمات بھی کہے، ان کے مورخین اپنے فاتحانہ غرور اور جنگ جویانہ ذہن سے ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے غیر مسلموں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور دکھ بھی، لیکن آجکل کی لڑائیوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا مقابلہ گذشتہ زمانے کی لڑائیوں سے کیا جائے تو گذشتہ زمانے کی ساری جنگی سیہ کاریاں ماند پڑ جاتی ہیں، دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم سے جو خونریزی، ہولناکی، تباہی اور غارتگری برپا کی، وہ انسان کی تاریخ کا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ میں کسی فتح و تسخیر کے سلسلہ میں ایسی ہولناکی اور بربادی کی مثال نہیں ملے گی، ان سطروں کے لکھتے وقت ریڈیو سے یہ خبر سنی کہ امریکن فوج نے شمالی ویٹ نام میں کم از کم پچھتر لاکھ بم گرائے ہوں گے، اس سفاکی کی مثال تو تیمور جیسے ظالم سفاک کے یہاں بھی نہیں ملے گی، پھر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں بھی فتح و تسخیر کے سلسلے میں کیا نہیں ہوتا رہا، ۱۰۶۶ء میں ولیم اول نے برطانیہ پر حملہ کیا تو اس کا حکم تھا کہ آدمی اور جانور دونوں میں کسی کی رعایت نہ کیجائے، گھر، غلہ، کاشتکاری وغیرہ سب برباد کر دیے جائیں، نوسال تک یورک اور ڈرہم کے بیچ میں زمین کے کسی ٹکڑے پر کھیتی نہیں ہوئی، چند سال کے اندر سارے عہدے اور اختیارات ملکی باشندوں سے لیکر نارمنوں کو دیدیے گئے، جنھوں نے اصلی باشندوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا، انکے کھیتوں کو برباد کیا، ان کی عورتوں سے بدسلوکی کی، افراد کو جیلوں میں رکھا، ایک لاکھ عورتوں

اور مردوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا، سترہویں صدی میں جرمنی میں تیس سالہ جنگ شروع ہوئی جس میں یورپ کی کئی حکومتیں ملوث ہوئیں، اس طویل مدت کی لڑائیوں میں بوہیمیا کے ۳۵ ہزار گاؤں میں صرف چھ ہزار گاؤں باقی رہ گئے، موردیا، بیوریا، فرنکونیا، سوابیا وغیرہ خوں ریزی، قحط اور وباؤں سے بالکل تباہ ہو گئے، جرمنی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں صرف ساٹھ لاکھ آدمی زندہ رہ گئے، ایسی مثالیں یورپ کی تاریخوں میں بکثرت ملیں گی۔

ہندوستان کے مسلمان فاتحوں کی ہولناکی اور خونریزی کا مقابلہ یورپ کے فاتحین سے کیا جائے تو پھر ان کی کہانی زیادہ ہولناک نظر نہ آئے گی، گو ظلم بہرحال ظلم ہے، ظلم میں زیادہ اور کم کا سوال نہیں ہوتا لیکن کسی حکومت کے ظلم وستم، جبر و استبداد کے واقعات کے مقابلہ میں اس کے فیاضانہ سلوک اور روادارانہ برتاؤ کا پلہ بھاری رہے، تو وہ یقیناً قابل تعریف ہے، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں اگر قہرمانی اور ستم آرائی ہوئی تو اس کی کہانیاں ان کے لیے چھوڑ دیجئے جو نفرت و حقارت پھیلا کر دلوں کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن آیئے ذرہ مہر و وفا، یگانگت و موانست اور اخلاص و محبت کی داستانیں بھی سُن لیجئے،

ہندوستان سے عربوں کا لگاؤ

ہندوستان میں مسلمانوں کی باضابطہ تاریخ عربوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے، عربوں کو تو ہندوستان سے ہمیشہ بڑا لگاؤ رہا، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسلام سے بہت پہلے زمانۂ جاہلیت میں اپنی لڑکیوں اور محبوباؤں کے نام ہندہ رکھتے تھے اور بہت سی ہندوستانی اشیا کے نام مثلاً ہندی تلوار، صندل اور عود کا ذکر اس دور کے شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے، اور جب کلام پاک نازل ہوا تو بقول استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی اس میں جنت کی تعریف میں اس جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں مسک (مشک)، زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور) کا ذکر ہے (عرب و ہند کے تعلقات صـ۷)

عربوں کا یہ خیال رہا کہ حضرت آدمؑ دنیا میں دجنا کے مقام پر اتارے گئے جو ہندوستان میں واقع ہے، نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین پر ہوا۔ (تفسیر درمنثور سیوطی ج ۱ ص ۵۵) اسی مناسبت سے عربوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے، اور حضرت علیؓ نے بھی فرمایا کہ سب سے پاکیزہ اور خوشبودار مقام ہندوستان ہے، (سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان باب اول)۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے صاحبزادے امام زین العابدین کی والدہ ماجدہ نسلاً سندھی تھیں، گو ان کو ایرانی بھی بتایا جاتا ہے، اگر پہلی روایت صحیح سمجھ لیجائے تو اسلام کے قابل احترام طبقہ یعنی سادات کے ایک بڑے حصہ کا تعلق اسی برصغیر سے ہو جاتا ہے، تاریخی حیثیت سے عربوں کا بحری بیڑا حضرت عمرؓ کے زمانہ (۱۵ھ ۶۳۶ء) میں بمبئی ہی کے علاقہ تھانہ میں آیا تھا، جو اس وقت ایک اہم بندرگاہ تھا، اس کے بعد یہ عرب بھروچ اور پھر دیبل کی طرف بڑھے، یہ سب علاقے ایک عرصہ دراز تک بمبئی ہی میں شمار کیے جاتے تھے،

محمد بن قاسم کی مہم

ان علاقوں میں عرب تاجر برابر آتے جاتے رہتے، جن کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ولید بن عبدالملک (۸۶-۹۶ھ / ۷۰۵-۷۱۵ء) کے زمانے میں عراق کے حاکم حجاج ابن یوسف (المتوفی ۹۵ھ ۷۱۳ء) نے محمد بن قاسم کو فارس سے سندھ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا، یہ فوجی مہم اس لحاظ سے بڑی تاریخی کہی جاسکتی ہے کہ لشکر کشی کے باوجود اس میں مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا وہی عملی نمونہ پیش کیا گیا جو اسلام کی صحیح تعلیم تھی، یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی فوج سندھ میں پھول برساتی ہوئی داخل ہوئی، اس کی فوج کے نیزوں سے

کسی کو کاری زخم نہیں لگا، اس کی تلواروں سے خون نہیں بہا، اس کے آتشیں اسلحہ سے بربادی اور اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے غارتگری نہیں ہوئی، لڑائی بہرحال ہولناک اور خون ریز ہوا کرتی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خون ریز اور ہولناک لڑائیوں کے بعد ان عرب فاتحوں کا سلوک مفتوحوں کے ساتھ کیا رہا،

حجاج بن یوسف کی نصیحتیں

عام طور سے حجاج بن یوسف ایک بڑا جابر اور خونیں حاکم سمجھا جاتا ہے، لیکن سندھ کی فتوحات کے سلسلے میں اس نے محمد بن قاسم کو جو پہلی تحریری ہدایتیں بھیجیں اس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی تھیں:

خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو، صبر کرتے رہو، دشمن کے ملک میں پہنچو تو کشادہ جگہ میں اترو، جب ہاتھیوں کی فوج سامنے آئے تو الگ الگ ٹکڑیاں بناؤ اور جب وہ حملہ کریں تو ایک جگہ جم کر ان پر تیر برساؤ، برگستوان کو شیر اور ہاتھی کی شکل کا بنواؤ (چچ نامہ حیدرآباد اڈیشن، ص ۹۹-۹۸)

"ہمیشہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہا کرو، دعائیں پڑھتے رہو، خدائے عزوجل کا ذکر ہر وقت زبان پر رکھو، توفیق الٰہی سے نصرت کے خواہاں رہو، خداوند تعالیٰ تم کو فتح دے گا، لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم کو اپنا مددگار بناؤ ...... جب دشمنوں سے مقابلہ کرو تو خاموش رہو، اگر دشمن نعرے لگائیں، فحش بکیں اور لڑنے آئیں تو ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک حکم نہ پہنچے ...... (ایضاً ص ۱۰۱)

"جو مال، متاع، ہاتھی، گھوڑے تمہارے ہاتھ آئیں، ان کو تم اپنی ملکیت نہ سمجھو، تاکہ تم اپنے یاروں میں نیک نام رہو، ہر ایک کا احترام کرو، اور سب کی دلدہی میں لگے رہو، لشکر کو جن چیزوں کی احتیاج ہو اس کو رفع کرنے کی کوشش کرو، جب علاقہ پر حکومت

یقینی ہو جائے اور قلعے محفوظ ہو جائیں تو جو کچھ بچے اس کو رعایا کی رفاہ اور بہبود میں خرچ کرنے میں دریغ نہ کرو، ان کے کھانے پینے کا پورا انتظام کرو، سپاہیوں کو مالِ غنیمت بھی دو اور ایسی فیاضی کرتے رہو کہ لشکر میں غلہ ارزاں ہو، کاشتکاروں اور تاجروں کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کرو، کیونکہ ان کی مرفہ حالی اور آسودگی سے ملک مزروع اور آباد رہتا ہے، اور اس طرح وہ تمہاری طرف بھی مائل رہیں گے۔ (ایضاً ص ۱۱۶)

"جو کوئی تم سے اقطاع یا ولایت کا طلب گار ہو تو اس کو نا امید نہ کرو، اس کے التماس کو قبول کرو، رعایا کو امان دے کر ان کے دلوں کو مضبوط کرو، بادشاہی کے چار ارکان ہیں، (۱) مدارا (یعنی خاطر داری)، مواساۃ (دلجوئی)، مسامحت (ہمدردی) مصاہرت (رشتہ داری)، (۲) مال اور عطیہ کا لینا دینا (۳) دشمنوں کی مخالفت میں صحیح رائے قائم کرنا، (۴) رعب، ہیبت، شہامت، قوت اور شوکت کا اظہار کرنا، ان باتوں سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہئے، راجہ جس بات کا التماس کریں اس کا پورا عہد کر کے ان کو راہ پر لاؤ، جب وہ خدمت کے لیے آمادگی کا اظہار کریں اور مال گذاری خزانے میں ادا کرتے رہیں تو ان کو ہر طرح کی قوت پہنچاتے رہو، دشمنوں کے مکر و فریب سے بچتے رہو، .... مسلمانوں کا کوئی سفیر کہیں بھیجو تو اس کا مذہبی عقیدہ درست ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر بات کو رعب کے ساتھ جھجک کے بغیر کہہ سکے، .... جو شخص وحدانیت الٰہی کا اقرار کرے اور تمہاری اطاعت قبول کر لے، تو اس کے تمام مال و اسباب، علاقے زمین اور کھیتی کو برقرار رکھو، اور جو اسلام قبول نہ کریں، ان کو اسی حد تک گزند پہنچاؤ کہ وہ مطیع ہو جائیں، جو لوگ تمرد اختیار کریں تو ان سے لڑنے کے لیے تیار رہو، ایسی جگہ جا کر لڑو جہاں زمین کشادہ ہو، تاکہ مرد مرد کے ساتھ اور شور در شور کے ساتھ

میدان میں جولانیاں کر سکیں، جب لڑائی میں مصروف ہو جاؤ تو کرم الٰہی پر توکل کرو (ایضاً ص ۱۲۸-۱۲۹)

محمد بن قاسم کا فیاضانہ برتاؤ

حجاج بن یوسف بڑا زبردست حاکم گذرا ہے، اس کے احکام کی سرتابی مشکل سے ہوا کرتی تھی، محمد بن قاسم اس کو اپنا شفیق بزرگ سمجھتا رہا، کیونکہ وہ اسکا چچا زاد بھائی ہونے کے علاوہ اس کا داماد بھی تھا، حجاج بھی اس کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس لیے دونوں کے فکر و عمل میں بڑی ہم آہنگی رہی، اسکے علاوہ محمد بن قاسم میں ذاتی طور پر غیر معمولی شرافت اخلاق اور شرافت نفس تھی، اس لیے اس نے نہ صرف حجاج کے احکام کی پوری تعمیل کی، بلکہ جنگ کے بعد اس نے اپنے مفتوحوں، صلح خواہوں اور امن پسندوں سے جو روادارانہ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کیا، وہ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

سندھ پر فوج کشی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ لنکا کے راجہ نے حجاج بن یوسف کے پاس خیر سگالی کا ایک وفد بھیجا تو اس وفد کے ساتھ آٹھ جہاز تھے، جن میں راجہ کی طرف سے تحائف بھرے تھے، ان جہازوں میں ایک مسلمان تاجر کی بیوہ عورت اور یتیم لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں، اور مسلمان عورت اور مرد بھی حج کے ارادہ سے ان پر سوار ہو گئے تھے، یہ جہاز بلاد تاذرون میں پہنچے تو باد مخالف کی وجہ سے دیبل کی طرف بہک گئے، یہاں کے بحری قزاقوں نے ان جہازوں کا سارا مال لوٹ لیا، اور مسافروں کو قید کر لیا، ان قیدیوں میں قبیلہ عزیز کی ایک عورت بے اختیار پکار اٹھی یا حجاج اغثنی (اے حجاج بچاؤ) حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بے تاب ہو گیا اور اس نے سندھ فتح کرنے کا مصمم ارادہ کیا، پہلے دو فوجی مہموں کو تو ناکامی ہوئی لیکن محمد بن قاسم ہر طرح کامیاب رہا، وہ اردبیل فتح کر کے دیبل کی طرف بڑھا اور جب اس کو فتح کرنے میں لگا ہوا تھا تو ایک برہمن اس کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ہماری نجوم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ لشکر اسلام کی فتح ہوگی، پھر ایک

جوتشی نے آکر یہ بھی بشارت دی، اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر میرے اہل وعیال کے جان و مال کی امان دی جائے تو وہ ان مسلمان قیدیوں کا پتہ بتا سکتا ہے جو لنکا کے جہاز پر سے گرفتار کرلیے گئے ہیں، محمد بن قاسم نے اس کو امان دی اور اسی کی مدد سے وہ قیدی محمد بن قاسم کے پاس لائے گئے، یہ قیدی ایک ایسے شخص کی حراست میں تھے جو عاقل، دانا، پرہیزگار اور ادیب بھی تھا، محمد بن قاسم نے اس کو سزا دینا چاہا، لیکن اس نے عرض کیا کہ قیدی خود بتائیں گے کہ اس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، قیدیوں نے بالاتفاق کہا کہ اس نے ہماری تواضع و مدارات کی جس کے لیے ہم اس کے شکر گذار ہیں، اور وہ ہمیشہ اسلامی لشکر کی خوش خبری سے ہمارے دلوں کو تسکین دیتا رہا، یہ سنکر محمد بن قاسم نے اس شخص کو معاف کردیا جس کے بعد اس نے اسلام قبول کرلیا، محمد بن قاسم نے خوش ہوکر اسکو دیبل میں اپنا نائب مقرر کیا، اور یہ پورا علاقہ اس کی امارت میں دیدیا (ایضاً ص ۱۰۸-۱۰۹)

مفتوحین سے حسن سلوک | نیرون کے محاصرہ کے بعد جب محصورین نے اس کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا تو اس کی خبر محمد بن قاسم نے حجاج کو دی، اس نے فوراً لکھا کہ جو تم سے امان چاہتے ہیں ان کو پناہ دو، اگر کسی جگہ کے اکابر تم سے آکر ملیں تو ان کو قیمتی خلعت دو، اور ان کو اکرام و انعام سے سرفراز کرنا ضروری سمجھو، عقل کو اپنا پیشوا بناؤ تاکہ اس علاقہ کے امرا اور معارف تمہارے قول و فعل پر اعتماد کریں، محمد بن قاسم نے ان ہدایتوں پر عمل کیا، اور نیرون کے حاکم کو کہلا بھیجا کہ اب جب کہ قلعہ کا دروازہ کھل گیا ہے، تمہارے اکرام و احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، اس پیام کے بعد نیرون کا حاکم بہت سے تحائف لے کر محمد بن قاسم کے پاس آیا، پھر اپنے قلعہ میں واپس ہوکر محمد بن قاسم کی ضیافت کی، اور برابر اس کے پاس تحفے بھیجتا رہا، لشکر میں غلہ کی کمی تھی جسکو اس نے پورا کیا۔ (ص ۱۱۰-۱۱۱)

محمد بن قاسم کے اس سلوک کا اثر سندھ کے اور دوسرے باشندوں پر بھی پڑا جب وہ سیوستان کی طرف بڑھا تو اس کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجا بجھرا (بیجے رائے) تھا، وہاں کے بودھوں اور دوسرے لوگوں نے بجھرا کے پاس ایک عرضداشت بھیجی کہ ہم کو معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے پاس امیر حجاج کا فرمان ہے کہ جو شخص اس سے امان مانگے اس سے عہد و پیمان کرکے اس کو اپنی پناہ میں لے لو، اہل عرب بہت باوفا ہیں، وہ جس بات کا وعدہ کرلیتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں، بہتر ہے کہ ہم ان سے عہد و پیمان کرلیں، بجھرا نے لوگوں کی باتیں نہ مانیں، لڑائی ہوئی اور اس کو شکست ہوئی، جس کے بعد سیوستان کے لوگوں نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کرلی، سیوستان تک اسلامی لشکر کو پہنچانے میں نیرون کے حاکم نے ہر طرح مدد کی، (ص ۱۳۰-۱۱۹)

محمد بن قاسم سیوستان سے سیسم کی طرف بڑھا، تو راستہ میں راجہ داہر کے ایک ماتحت حاکم کاکا کوتک نے اس کی اطاعت قبول کرلی، وہ مذہباً بودھ تھا، جب اپنے ماتحت سرداروں اور معتمدوں کے ساتھ محمد بن قاسم کے پاس پہنچا تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، محمد بن قاسم نے اس سے پوچھا، اے امیر ہند! تمہارے یہاں خلعت دینے کی کیا رسم ہے، کاکا نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں یہ رسم ہے کہ خلعت پانے والے کو کرسی دیجاتی ہے، اس کو ریشم اور حریر کے ہندو وضع کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور اس کے سر پر پگڑی باندھی جاتی ہے، محمد بن قاسم نے کاکا کو اسی طرح خلعت عطا کیا جس سے نواح کے لوگوں پر اطاعت گذاری کا بڑا اچھا اثر پڑا، محمد بن قاسم اور کاکا سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے، اس دوستی سے اسلامی لشکر کو آیندہ فتوحات میں بڑی مدد ملی، کاکا نے بھی اسلامی طاقت سے ہر قسم کے فوائد حاصل کیے، اسکے پاس بڑی دولت جمع ہوگئی اور اسکے

دشمن اس کی راہ سے ہٹ گئے۔ (ص ۱۳۴-۱۲۲)

محمد بن قاسم ۹۳ھ میں قلعہ اشہار کو فتح کر کے دریائے سندھ کے مغربی کنارے آیا، توسورتہ کے حاکم موکہ بن بسایا نے ۲۰ بیس سرداروں کے ساتھ اس کے سامنے سپر ڈالدی، جب یہ لوگ اس کے پاس آئے تو موکہ کو کرسی پر بیٹھایا، ایک لاکھ درہم بطور انعام عطا کیے، ایک سبز چتر بھی مرحمت کیا، جس کی چوٹی پر مور بنا ہوا تھا، علاقہ بیٹ کی حکومت بھی اسکے سپرد کی، اور ایک عہد نامہ لکھکر دیا کہ اس علاقہ کی حکومت اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہے گی، اس کے سرداروں کو بھی خلعت اور گھوڑے دیے، ان عنایتوں کی وجہ سے موکہ عربوں کا بڑا وفادار بن گیا، اس نے آیندہ فتوحات میں ہر قسم کی مدد پہنچائی (۱۳۶-۱۳۵)

ضرورت سے زیادہ رواداری پر حجاج بن یوسف کا انتباہ

راجہ داہر اپنے ماتحت حاکموں کو اس طرح محمد بن قاسم سے ملتے دیکھ کر بہت پریشان ہوا، اس نے اپنے بیٹے جے سیہ (جے سنگھ) کو عربوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بیٹ کی طرف روانہ کیا، وہ بڑھکر دریائے اٹک کے ساحل پر مقیم ہوا، یہاں پچاس روز تک دونوں فوجیں قریب ہی پڑی رہیں، محمد بن قاسم کے لشکر میں قحط پڑ گیا، گھوڑے بڑی تعداد میں مرنے لگے، راجہ داہر خوش ہوا، اور طنز آمیز باتیں لکھکر اس کو صلح کا پیغام بھیجا، یہ معلوم کر کے حجاج نے مزید گھوڑے اور سامان بھیجے، محمد بن قاسم کی ضرورت سے زیادہ رواداری سے اندیشہ ناک ہو کر بطور انتباہ یہ لکھا کہ تم دشمنوں کو امان دینے میں بڑے حریص ہو گئے ہو، یہ امر مجھکو مکرر وہ معلوم ہوتا ہے، جس دشمن کی عداوت کا امتحان ہو چکا ہو اس کو امان دینا مناسب نہیں، وضیع اور شریف کو ایک سطح پر نہیں رکھنا چاہیے، عقل سے اس طرح کام انجام دو کہ دشمنوں کو تمہارے عجز کا خیال نہ ہو، مدت سے تم دشمنوں کے مقابل میں پڑے ہو، تم صلح کی کوشش کرتے ہو، اس صلح جوئی کو لوگ تمہارے

فتور و قصور پر محمول کریں گے، تم اپنی سیاست اور شہامت کو بچا رکھو، اپنی سہم و فہم پر بھروسہ کرو، راست گو اور قوی رائے بنے رہو، غفلت کو راہ نہ دو، عزم مصمم کے ساتھ خدا کے آگے دل و جان کو حاضر رکھو۔ (چچ نامہ ص ۱۵۲-۱۵۱)

محمد بن قاسم کے ساتھ ٹھاکروں اور جاٹوں کا تعاون

موکہ بن بسایا نے اس سلسلے میں مدد کے طور پر کشتیاں فراہم کیں، بھیم کے ٹھاکروں اور پچھم کے جاٹوں کو لیکر حاضر ہوا اور سا کرہ کے سرداروں کو جزیرہ بیٹ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ غنیم کی پیش قدمی کو روکیں (ایضاً ص ۱۵۵)

راجہ داہر کی ایک فوج سے محمد بن قاسم کے لشکر کی مڈبھیڑ رجبپور کے مقام پر ہوئی، موکہ کا بھائی راسل داہر کی فوج کے ساتھ تھا، کیونکہ داہر نے بیٹ کا علاقہ اس کے سپرد کر دینے کا وعدہ کیا تھا، داہر کی فوج کو شکست ہوئی تو راسل محمد بن قاسم سے آکر مل گیا، جب وہ اس کے پاس آیا تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے کہا کہ تم آگئے ہو تو مل کر رہو، تمھارے ساتھ ہر قسم کی عنایتیں کی جائیں گی، جو علاقہ تم مانگو گے تم کو دیا جائیگا، راسل نے جواب دیا کہ آپ نے رہین منت کیا ہے تو آپ کی اطاعت برابر کرتا رہوں گا (ایضاً ص ۱۶۶)

راسل اور موکہ دونوں نے مل کر محمد بن قاسم کو آگے بڑھنے اور مقامی جھیل اور ندی پار کرنے میں رہنمائی کی، اور دونوں نے اسلامی لشکر کا قبضہ جے پور نامی ایک گانوں پر کرا دیا، جو فوجی لحاظ سے اہم مقام تھا۔ (ایضاً ص ۱۶۷)۔ راجہ داہر کو خبر ملی تو اس مرتبہ خود فوج لے کر بڑھا، اور یکم رمضان ۹۳ھ کو طرفین کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی، کئی روز تک جنگ جاری رہی، اس درمیان میں چند برہمن محمد بن قاسم کے پاس آئے، امان کی درخواست کی اور پھر انھوں نے اطلاع دی کہ راجہ داہر کی فوج عقب سے غیر محفوظ ہے، اس اطلاع پر محمد بن قاسم کے سرداروں نے ان برہمنوں کی معیت میں زبردست

حملہ کیا جس سے غنیم میں ابتری پھیلی (ایضاً ص ۱۷۷) پانچ روز تک لڑائی ہوتی رہی، آخری روز راجہ داہر مارا گیا (ص ۱۸۱)۔ پھر راجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ اور اس کی ایک دوسری بیوی رانی بائی نے راور کے قلعہ میں محصور ہو کر محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا لیکن راور بھی فتح کر لیا گیا، رانی تو ستی ہو گئی، اور جے سنگھ برہمن آباد چلا گیا، (ایضاً ص ۱۹۴) محمد بن قاسم برہمن آباد کی طرف بڑھا تو راستہ میں بہرور اور دہلیلہ کے قلعوں کو فتح کر لیا، (ایضاً ص ۱۹۸)

راجہ داہر کے وزیر کی عزت افزائی

دہلیلہ کی فتح کے بعد راجہ داہر کا وزیر سی ساکر محمد بن قاسم سے امان کا طلب گار ہوا، اسلامی لشکر میں آیا تو محمد بن قاسم اس سے بڑی عزت کے ساتھ ملا، اس کی تعظیم و تکریم میں کسی بات کی فروگذاشت نہیں کی، اس کے استقبال کے لیے اپنے امراء کو بھیجا، اور پھر اپنا وزیر بنا لیا، جس کے بعد وہ مسلمانوں کے معاملات کا مشیر ہو گیا، محمد بن قاسم نے اپنا سارا راز اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا، اپنے علاقہ کے معاملات، حکومت کے انتظامات اور مہمات کی تفصیلات کے بارے میں اس سے صلاح و مشورہ کرنے لگا، ایک روز سی ساکر نے اس سے کہا "اے امیر عادل! آپ نے زمین کی مالگذاری قدیم رسم و رواج کے مطابق مقرر کی ہے، اس میں دست درازی نہیں ہوتی ہے، رعایا کی گردن پر کسی محصول کا بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے، اس سے رعیت نہایت خوش ہے، رعایا نوازی اور عدل گستری کا ایسا آئین و دستور ہے جس سے سارے دشمن پامال ہوں گے، رعایا خوش رہے گی اور ملک فتح ہوگا، (ص ۲۰۰ نیز دیکھو تاریخ ہندوستان جلد اول از ذکاء اللہ ص ۲۱۲)

برہمن آباد کے باشندوں اور برہمنوں کے ساتھ حسن سلوک

دہلیلہ سے محمد بن قاسم برہمن آباد کی طرف بڑھا، تو جے سنگھ کے سپاہی یلغار کر کے اس کے لشکر میں رسد پہنچنے نہیں دیتے اور

طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے، محمد بن قاسم نے اس کی اطلاع موکہ کو دی تو وہ ان تخریبی کارروائیوں کو روکنے کے لیے ایک لشکر کے ساتھ پہنچا اور اس کے ساتھ مسلمان فوجی امرا نباتہ بن حنظلہ کلابی، عطیہ ثعلبی، صارم بن ابی صارم ہمدانی، عبدالملک مدنی بھی ہوئے، ان سب کا سردار موکہ ہی کو بنایا گیا، جس نے آگے بڑھ کر جے سنگھ کو ایسا خوفزدہ کیا کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا، (ص ۲۰۲-۳)

برہمن آباد پہنچ کر محمد بن قاسم نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کیا، جو چھ مہینے تک جاری رہا موکہ بھی ساتھ رہا، اس نے محمد بن قاسم کے دوران محاصرہ میں مشورہ دیا کہ یہ قلعہ شہروں کی آبرو ہے، اگر یہ قبضہ میں آگیا تو سارا سندھ اس کے زیر نگیں آجائیگا اور دوسرے مستحکم قلعے ماتحت ہو جائیں گے، داہر کی اولاد یا تو مطیع ہو جائے گی یا بھاگ کھڑی ہوگی، (ایضاً ص ۲۰۵) محصورین نے سپر ڈال دی، وہ امان کے طلب گار ہوئے تو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ جو کوئی لڑے تو اس کو مارو، ورنہ کسی اور پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، قلعہ والوں میں سے جس نے محمد بن قاسم کے آگے آکر سر جھکا دیا، اس کا سر اس نے اونچا کیا، اس کو امان دی، اور اس کو اس کے گھر میں آباد کیا، (ایضاً ص ۲۰۶) قیدیوں میں داہر کی ایک رانی لادی نامی بھی تھی، داہر کی دو بیٹیاں بھی تھیں، جو اس کی دوسری رانی کے بطن سے تھیں، وہ جب محمد بن قاسم کے سامنے لائی گئیں تو ان کے چہروں پر نقاب ڈال کر علیحدہ بٹھائی گئیں، (ایضاً ص ۲۰۷) بعد میں محمد بن قاسم نے ولید بن ملک اور حجاج کی اجازت سے رانی لادی کو خرید لیا اور سیاسی مصلحت کی بنا پر اس سے نکاح کر لیا، قلعہ کے کاریگروں، تاجروں، پیشہ وروں اور عام لوگوں کو امان دی گئی، قیدی رہا کر دیے گئے، قلعہ کے برہمنوں کو دکھ تھا کہ ان کو شکست ہوئی، وہ بھدرا کر کے محمد بن قاسم کے پاس آئے، زرد لباس پہنے ہوئے تھے،

ماتم کرتے ہوئے محمد بن قاسم سے کہا کہ اے امیر! ہمارا راجہ برہمن تھا، تم نے اس کو قتل کیا، اس کے جو وفادار تھے وہ تو لڑ کر مر گئے۔ ہم زرد لباس پہنے اور ماتم کرتے ہوئے تمہارے پاس آئے ہیں، تم ہم لوگوں کے متعلق کیا حکم دیتے ہو، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ میں اپنے سرو جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تم بڑے وفادار ہو، میں تم کو امان دیتا ہوں، اس شرط پر کہ تم داہر کے ماننے والوں کا پتہ بتا دو، برہمنوں نے اس کی تعمیل کی۔ (ایضاً ص ۲۰۸)

برہمنوں کی ایمانداری پر بھروسہ

اس کے بعد محمد بن قاسم ملکی انتظام میں لگ گیا، جو لوگ اپنی خوشی سے اسلام لائے ان کے حقوق عربوں کی طرح ہو گئے، اور جنھوں نے اسلام قبول کرنا پسند نہیں کیا، ان کو جنگی ٹیکس یعنی جزیہ دینا پڑا، جو لوگ مالدار تھے ان سے فی کس ۴۸ درہم نقرئی یعنی تقریباً ۱۲ روپے، متوسط درجہ کے لوگوں سے فی کس ۲۴ درہم یعنی چھ روپے، اور کم حیثیت لوگوں سے بارہ درہم یعنی تین روپئے سالانہ وصول کئے گئے، اس کے بدلے میں ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنے اسلاف کے مذہب پر قائم رہیں، اور اپنی ساری ملکیت یعنی کھیت اور گھوڑے اپنے قبضہ میں رکھیں، (ایضاً ص ۹-۲۰۸) برہمن آباد وہاں کے امینوں کے حوالہ کر دیا گیا، اور ہر ایک امین سے اس کی حیثیت کے مطابق زر مال گذاری ادا کرنے کا وعدہ لیا گیا۔ قلعہ کے چار دروازوں کا اہتمام بھی ان ہی کے سپرد کر دیا گیا، ہندوستان کے رسم و رواج کے مطابق ان کے ہاتھ پاؤں کے لیے ان کو سونے کے کڑے اور گھوڑے مع زین کے دیئے گئے، ان میں سے ہر ایک کے لیے دربار میں جگہ مقرر کی گئی، جن تاجروں، صناعوں اور کاشتکاروں کو نقصان پہنچا تھا ان کے لیے حکم صادر کیا گیا کہ خزانے سے ان کو چاندی کے بارہ درہم دیئے جائیں، (ایضاً ص ۲۰۹) محمد بن قاسم برہمنوں کی طرف زیادہ مائل ہوا، ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا، کیونکہ اس کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ

یہ ایماندار ہوتے ہیں، اس کے ساتھ دغا نہ کریں گے، وہ ان کو عہدے یہ کہکر دیتا کہ یہ نسلاً بعد نسلٍ تمہارے یہاں برقرار رہے گا، دوسروں کو نہیں دیا جائے گا، اس کا اچھا اثر پڑا کہ یہ برہمن علاقہ میں ہر جگہ جا کر یہ کہنے لگے کہ اگر یہاں کے لوگ عربوں کی نیازمندی کریں گے تو وہ انکے مورد فضل و کرم ہونگے، (ایضاً ص ۱۱-۲۱۰) چنانچہ کاشتکار وغیرہ خود محمد بن قاسم کے پاس آئے اور خراج دینا قبول کر لیا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن عمال کو ہدایت دی کہ سلطان اور رعایا کے درمیان پوری سچائی سے معاملات طے کیے جائیں، اگر تقسیم کا معاملہ ہو تو دونوں میں نصفا نصف طے کیا جائے، خراج اتنا مقرر کیا جائے کہ یہ ادا ہو سکے، خراج دینے والوں کے ساتھ زیادتی نہ کیجائے، تاکہ ملک خراب نہ ہونے پائے۔ (ایضاً ص ۲۱۱)

عام لوگوں کے ساتھ نرمی

یہ تو برہمن عمال کو ہدایت دی گئی، پھر محمد بن قاسم نے تمام لوگوں کو علیحدہ بلا کر ان سے کہا کہ تم ہر طرح خوش رہنے کی کوشش کرو، کسی بات کا اندیشہ نہ لاؤ، تم سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے گا، میں تم سے خراج کے لیے کوئی دستاویز یا قبالہ نہیں لکھاتا ہوں، جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے اس کو ادا کرتے رہو، وصولی میں بھی تمہارے ساتھ نرمی اور رعایت کی جائے گی، تمہاری ہر درخواست کی شنوائی ہو گی، شافی جواب پاؤ گے، اور تمہاری ہر مراد پوری ہوتی رہے گی۔ (ایضاً ص ۲۱۲)

مندروں میں عبادت کی عام اجازت

برہمن آباد میں ایک بہت بڑا مندر تھا، لڑائی کے زمانہ میں یہاں لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، فتح کے بعد بھی لوگ خوف کی وجہ سے یہاں نہیں آتے جاتے تھے، جس سے اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی، مندر کے برہمن اور مہنت فاقہ کرنے لگے، ایک روز وہ محمد بن قاسم کے دروازے پر آئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا اے امیر عادل! آپ کو بقا حاصل ہو، ہم مندر کے پجاری ہیں، ہم کو اسی مندر سے روزی ملتی ہے، آپ نے سب پر رحم کیا،

سوداگروں کو مال دلوادیا، تاجروں کی تجارت کھلوادی، اوروں کو ذمی بنا کر اپنے کاموں میں لگا دیا، ہم کو کرم خداوندی سے امید ہے کہ آپ ہندوؤں کو حکم دیں گے کہ وہ مندر میں آکر اپنے معبود کی پرستش کریں، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ تمھارا مندر اروڑ کے دارالسلطنت سے متعلق ہے، اس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہے، ہندوؤں نے عرض کیا کہ یہ مندر برہمنوں سے متعلق ہے، یہ ہمارے پنڈت اور پروہت ہیں، ہمارے یہاں کی شادی اور غمی میں وہی رسمیں ادا کرتے ہیں، ہم نے خراج دینا اسی لیے قبول کر لیا ہے کہ ہم میں ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی، ہمارا مندر خراب ہو رہا ہے، ہم وہاں جا کر پوجا کرنے سے محروم ہیں، آپ اس کی مرمت کرادیں تاکہ ہم وہاں جا کر پوجا کریں، اور ہمارے برہمنوں کی وجہ معاش ہو، محمد بن قاسم نے یہ ساری باتیں حجاج کو لکھ کر بھیجیں، وہاں سے جواب آیا کہ

حالات معلوم ہوئے، اگر برہمن آباد کے مقدم اپنا مندر بنانا چاہتے ہیں تو اب جبکہ انھوں نے ہماری اطاعت قبول کرلی ہے اور دارالخلافت میں مال کے ادا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے تو اس مال کے علاوہ ان پر ہمارا کوئی اور حق نہیں، جب وہ ذمی ہوگئے ہیں تو ان کے جان و مال میں کسی طرح کا تصرف صحیح نہیں، ان کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، مذہب کی پیروی میں کسی شخص پر زجر نہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر میں جس طرح چاہے رہے۔

پرانے مراسم کا تحفظ حجاج کے اس فرمان کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے اہم لوگوں، مقدموں اور برہمنوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنے مندر کی تعمیر کرائیں، مسلمانوں کے ساتھ خرید و فروخت کریں، بے خوف و خطر رہیں، اپنے حال کو بہتر بنانے میں کوشاں رہیں، بھکاری برہمن کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اپنے باپ دادا کے مراسم کو بجا لائیں، برہمنوں

کو جو عطیے یعنی دکھشنا دیے جاتے تھے وہ اب بھی دیے جائیں، مالگذاری کے سو درہم میں تین درہم برہمنوں کے لیے علحدہ کر دیے جاتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت ان کی مدد ہوتی رہے، اور بقیہ رقم خزانہ میں داخل کر دی جاتی تھی، تاکہ اس میں خیانت نہ ہو، یہ روایت باقی رکھی جائے، امراء جو مواجب برہمنوں کو دیا کرتے تھے، وہ پہلے کی طرح دیا کریں، برہمنوں کو اس کی بھی اجازت دی گئی کہ وہ بدستور سابق ایک تانبے کا برتن لیکر گھر گھر جائیں، غلہ مانگا کریں تاکہ وہ بھوکے نہ رہیں، محمد بن قاسم نے برہمنوں کی تمام باتوں کو تسلیم کرنے کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے مندر ایسے ہی ہیں کہ جیسے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے آتشکدے ہیں، ان کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں عبادت کریں، محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے مقدموں کو رانا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (ایضاً ص ۱۴-۲۱۳)

رعیت نوازی کی تلقین اس نے لوہانہ کے جاٹوں کی قدیم روایات کو برقرار رکھا، گو وہ بہت ہی وحشیانہ تھیں لیکن ان میں دخل اندازی کرنا پسند نہیں کیا، حجاج نے ایک دوسرے مراسلہ میں محمد بن قاسم کی سپہ داری، رعیت نوازی، ملکی انتظام اور رفاہ عام کے کاموں کی تعریف کی، کیونکہ جو خراج مقرر کیا گیا تھا وہ پابندی سے وصول ہو جاتا تھا، پھر ایک دوسرے خط میں ہدایت دی کہ وہ رعیت نوازی اور عدل گستری کا ایسا نمونہ پیش کرے کہ اس کا نام روشن ہو، اور دشمن اس کی اطاعت کے آرزومند ہوں۔ (ایضاً ص ۲۱۷)

صناعوں، تاجروں اور کسانوں کی حوصلہ افزائی محمد بن قاسم برہمن آباد سے چل کر منہل پہنچا، تو وہاں کے سمانی باشندوں کے سرداروں اور تاجروں نے اطاعت قبول کر لی، تو ان کو امان دی گئی کہ وہ مالگذاری پابندی سے ادا کرتے رہیں اور اپنے وطن میں اطمینان کی زندگی بسر کریں، محمد بن قاسم نے ان ہی کے ہر فرقہ کے ایک آدمی کو سردار مقرر کیا اور جب اس کی خبر حجاج

کو دی گئی تو اس نے لکھا کہ جو اطاعت قبول کریں تو ان کے حلق میں صفائی کا پانی جاری کر دو، ان کو امان دو، ان کے صناعوں اور تاجروں پر زیادہ بار نہ ڈالو، اور جو زراعت اور عمارت میں تن دہی سے کام کرتے ہوں ان کو مالی مدد کر کے ان سے خاطر تواضع سے پیش آؤ، جو لوگ اسلام لے آئیں ان سے زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ یعنی عشر لو، اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں تو وہ قدیم دستور کے مطابق اپنی صنعت و زراعت میں سے اتنا ہی مال ادا کریں جتنا وہ پہلے دیتے آئے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

مقامی باشندوں کے ناچ پر انعام

محمد بن قاسم کے رحم و کرم کی شہرت ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ جب وہ منسل سے قوم شمہ کے حدود میں لوہانہ پہنچا تو وہاں کے لوگ ناچتے اور ڈھول بجاتے ہوئے اسکے استقبال کے لیے آئے، اور کہا کہ ان کے یہاں جب کوئی نیا بادشاہ یا والی آتا ہے تو وہ اس کا اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں، محمد بن قاسم اس ناچ سے محظوظ ہوا اور اس نے اپنے فوجی سردار خریم بن عمر سے بیس[۲] دینار سرخ انعام دلوائے۔ (ایضاً ص ۲۱-۲۲۰)

راجہ داہر کی رانی کا تعاون

محمد بن قاسم لوہانہ سے سہتہ پہنچا تو وہاں کے سردار اور کاشتکار ننگے پاؤں اور ننگے سر اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور امان کے خواہاں ہوئے، ان سے خراج لے کر ان کو امان دی گئی، اور ان ہی میں سے کچھ لوگوں نے عرب فوج کی رہبری الور تک کی جو سندھ کا بہت بڑا شہر اور پایہ تخت تھا، اس وقت یہاں راجہ داہر کا لڑکا گوپی (یا فوفی)، فرماں روا تھا، اس نے وہاں کے لوگوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے اور وہ ہند سے لشکر لا کر عربوں سے فیصلہ کن جنگ کرے گا، وہ قلعہ میں محصور ہو کر عربوں سے لڑنے میں مشغول ہوا، اس وقت تک رانی لادی محمد بن قاسم کے اخلاق حمیدہ سے متاثر ہو کر اس کی اطاعت گذار بیوی بن چکی تھی، اس نے سیاہ اونٹ پر سوار ہو کر

قلعہ والوں کو پکار پکار کر راجہ داہر کی موت کا یقین دلایا، اور ان کو امان طلب کرنے کی تلقین کی، لیکن قلعہ والے سمجھے کہ یہ چنڈالوں اور گائے کھانے والوں کا محض فریب ہے، کئی مہینے تک محاصرہ جاری رہا، آخر میں گوپی قلعہ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، قلعہ والوں نے امان طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھا، ان کو بھی امان دی گئی، محمد بن قاسم قلعہ میں داخل ہوا تو ایک مندر (نو بہار) سے گذرا، وہ اس کے اندر چلا گیا، دیکھا کہ ایک سنگ مرمر کے گھوڑے پر ایک عورت سوار ہے جس کے دونوں ہاتھوں میں یاقوت و جواہرات کے کنگن ہیں، اس نے عورت کے ایک ہاتھ سے کنگن اتار لیا، اور ایک پجاری سے مخاطب ہو کر بولا کہ تمھارے معبود کو خبر نہیں کہ اس کے ہاتھوں میں دو کنگن کے بجائے ایک رہ گیا ہے، یہ سن کر پجاری نے گردن نیچی کر لی، محمد بن قاسم نے ہنس کر بت کے ہاتھ میں کنگن ڈال دیا، اس کے بعد اس نے اعلان کیا کہ غیر فوجی لوگوں کو امان دی جائے، اور جو شخص مقابلہ کرے اس کو ہلاک کیا جائے،

معاہدے کی پابندی کا احترام

مقابلہ کرنے والوں میں ایک شخص آگے بڑھ کر بولا کہ میں ایک عجیب بات ظاہر کرنا چاہتا ہوں، جو میں امیر کے سامنے ظاہر کروں گا، وہ محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا، تو اس نے کہا کہ میں اس شرط پر ظاہر کروں گا کہ میرے اہل و عیال کے ساتھ مجھکو بھی امان دی جائے، محمد بن قاسم نے کہا میں نے تجھکو امان دی، اس نے پھر کہا کہ امان نامہ عنایت ہو اور اس پر دستخط ہوں، محمد بن قاسم کو خیال ہوا کہ شاید اسکے پاس بیش قیمت جواہرات یا زیورات ہوں اس لیے امان نامہ پر دستخط کر کے اس کے ہاتھ میں دیدیا، اس کے بعد اس شخص نے اپنی داڑھی اور مونچھوں اور بالوں کو دراز کیا، اپنے ہاتوں کی انگلیاں سر سے لگائیں، پھر رقص کرنے لگا، اور یہ کہتا جاتا تھا کہ ایسی عجیب

بات کبھی ظاہر نہیں ہوئی ہوگی، محمد بن قاسم کو تعجب ہوا کہ یہ کون سی عجیب بات ظاہر کرنے کے لائق تھی لشکریوں نے کہا کہ اس نے فریب دیا، اس کو امان نہ دی جائے، مگر محمد بن قاسم نے کہا قول قول ہے اور عہد عہد ہے، اس سے پھرنا بڑے آدمیوں کا کام نہیں، اس کو ہلاک کرنے کے بجائے قید میں رکھا جائے، اور حجاج کا بھی فیصلہ معلوم کیا جائے، اس کو اس کے خاندان کے بائیس آدمیوں کے ساتھ قید خانہ بھیج دیا گیا، حجاج کو اس معاملہ کی خبر بھیجی گئی، تو اس نے علماء کا فتویٰ لے کر حکم بھیجا کہ اس آدمی کو آزاد کر دیا جائے، تاکہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو (ایضاً ص ۲۲۸ - ۲۲۱)

راجہ داہر کے چچازاد بھائی پر اعتماد کلی

محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر بابیہ کا محاصرہ کیا، اس کے قلعہ کا حاکم ککسہ تھا جو راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، اس نے محمد بن قاسم کو نذرانے بھیجے، جس کے بعد عرب کے سپہ سالار نے اس کی بڑی خاطر کی، وہ بڑا عالم و حکیم بھی تھا، اس لیے محمد بن قاسم نے اس کو اپنا وزیر بنالیا، اور وہ تمام کلی و جزئی باتوں کا مشیر ہوگیا، اس کو تخت کے آگے بٹھایا جاتا، پھر تمام افسروں اور سپاہیوں کا افسر بنا دیا گیا، تمام نواحی علاقے اس کے سپرد کر دئے گئے، خزانہ کی کنجیاں بھی اس کے حوالہ کر دی گئیں، اور مبارک مشیر کا خطاب دیا گیا، وہ بھی محمد بن قاسم کا یار بن کر اس کی آئندہ لڑائیوں میں شریک رہا (ص ۲۳۶ - ۲۳۵)

برہمن کی خیرخواہی

محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو ایک برہمن نے اس پر یہ راز ظاہر کیا کہ یہاں ایک جگہ حوض ہے، جس کا دور ایک سو گز ہے، اس کے وسط میں ایک پچاس گز دور کا ایک مندر ہے، اس میں ایک کمرہ دس گز لمبا اور آٹھ گز چوڑا ہے، اس کے اندر بڑی دولت چھپا رکھی گئی ہے، اس کو پاٹ کر کے اس کے اوپر ایک مندر بنا دیا گیا ہے، جس میں سونے کی ایک

مورتی نصب کر دی گئی ہے، اور حوض کے گرد درخت لگا دیے گئے ہیں، محمد بن قاسم وہاں پہنچا تو وہاں اس کو دو سو تیس من سونا اور تیرہ ہزار دو سو من سونے کی خاک تانبے کے ٹکڑوں میں ملی (ایضاً ص ۲۴۰)

محمد بن قاسم کی موت پر ماتم

ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر سرحدی قلعوں کو فتح کیا، اور کیرج کے تسخیر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس کو حجاج کی وفات کی خبر ملی، یہ ۹۵ھ تھا، سندھ عراق کے حاکم کے ماتحت تھا، اس لئے محمد بن قاسم وہاں کے حاکم کی حمایت سے محروم ہوگیا، حجاج کے مرنے کے آٹھ مہینے کے بعد ۹۶ھ میں ولید بن عبدالملک کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد سلیمان تخت پر بیٹھا، جس کو حجاج سے عداوت کی حد تک اختلاف تھا، حجاج گو مر چکا تھا، لیکن اس کے حامیوں سے سلیمان نے انتقام لیا، سلیمان نے عراق کا حاکم یزید بن مہلب کو بنایا، جو حجاج اور اس کے خاندان کا پرانا دشمن تھا، وہ عراق کا حاکم بنا تو محمد بن قاسم اس کی نظروں میں کھٹکا، اس نے اس کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو مقرر کر دیا، اور جب محمد بن قاسم کیرج یا کورج فتح کر چکا تھا تو یزید نے سندھ پہنچکر اس کو گرفتار کر لیا، اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی ڈال کر عراق روانہ کر دیا، جہاں وہ قید خانہ میں ڈال دیا گیا، اور وہیں وفات پاگیا، عرب اور سندھ کے لوگ اس المیہ پر خون کے آنسو بہاتے رہے، ایک عربی شاعر حمزہ بن بیض الحنفی نے اپنے عربی مرثیہ میں کہا کہ بہادری، دل کی بڑائی اور فیاضی محمد بن قاسم کے حصہ میں تھی، وہ سترہ سال ہی کی عمر میں فوجوں کا سردار بن گیا، یہ سرداری زمانۂ ولادت سے کس قدر قریب تھی، ایک اور شاعر نے کہا محمد سترہ برس ہی کی عمر میں لوگوں کا سردار بن گیا، حالانکہ اس وقت اسکے ہم عمر شباب کی سرمستیوں اور دنیا کی رعنائیوں

میں فریفتہ ہوکر سیادت و قیادت کی حقیقت سے بے خبر اور غافل تھے۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۴، ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول، شائع کردہ دارالمصنفین ص ۱۰۲)

بلاذری ہی کا بیان ہے کہ اہل ہند نے محمد بن قاسم کے غم میں گریہ وزاری کی اور اس کا ایک مجسمہ کیرج میں تیار کیا۔ (فتوح البلدان ص ۴۴۰)

محمد بن قاسم کے کارنامے پر تبصرہ

شمس العلماء ذکاء اللہ نے محمد بن قاسم کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

اگرچہ محمد بن قاسم کی نوعمری اور شباب کا عالم تھا، مگر وہ بڑا مدبر اور شجاع تھا، شمشیر اور تدبیر دونوں سے کام لیتا تھا، اگر اتفاقیہ کہیں شمشیر سے کچھ ستم کیا تو تدبیر سے اسکی مکافات بھی ضرور کی، اگر کہیں بتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ بتخانوں کی مرمت کرنے کا بھی حکم دیدیا، اگر کہیں لوٹ مار سے دشمنوں کو خستہ حال کیا تو ان کو بیت المال سے معاوضہ بھی دلادیا، قدیم قاعدہ جو ہندوؤں کا تھا کہ زر مالگذاری میں سے تین فیصدی خزانہ شاہی میں اسلیے داخل کرتے تھے کہ اس روپیہ سے برہمنوں کو خدمات کا معاوضہ دیا جائے وہ اس نے بدستور قائم رکھا، یہاں جو شخص ہندی سندی ذی لیاقت اس کو ملا اس کی قدر شناسی کی، بلکہ یہاں کے لائق آدمیوں کو اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور سرفراز کیا، اس نے یہاں کے وزیروں کو وزیر اور مشیر اپنا مقرر کیا اور اپنے پاس ان کو رکھا، غرض مردم شناسی اور دلجوئی اس پر ختم تھی، دشمنوں کے ساتھ جو اس نے نیک سلوک کیے تھے، وہ کمتر کوئی کیا کرتا ہے۔

(تاریخ ہندوستان ج ۱ ص ۲۴۵)

موجودہ دور کے ہندو مورخین مسلمانوں کے دور کی تاریخ پر تبصرہ کرنے میں اپنے

ذاتی اور قومی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، پھر بھی ان کے قلم سے تعریفی کلمات کبھی کبھی نکل پڑتے ہیں، جادو ناتھ سرکار اپنی مشہور تصنیف "تاریخ اورنگ زیب" میں ایک جگہ ضمنی بحث میں یہ لکھ گئے ہیں:-

"شروع کے عرب فاتحوں خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادتگاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے، جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو انکو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کو ہوتے، ورنہ پھر ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا، جس کے بعد انکو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی آزادی ہوتی۔ (جلد سوم ص ۲۵۳)

الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمد بن قاسم کے کارناموں پر جہاں تنقیدیں کی ہیں، وہاں یہ بھی لکھتے ہیں:-

سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ تاریخ کی رومانی داستانوں میں سے ایک ہے، اس کی شگفتہ نوجوانی، اس کی جرأت مندی، اس کی بہادری اور فوجی مہمات کے درمیان اس کے شریفانہ برتاؤ اور آخر میں اس کے زوال کی المناکی سے اسکی ذات کے گرد شہادت کا ہالہ دکھائی دیتا ہے، اس نے اپنی نوجوانی میں سپہ گری کا جو جوہر دکھایا اس سے اس کی ذات سے بڑی امیدیں بندھ گئیں، اسی لیے وہ ہندوستان کی مہم پر بھیجا گیا، حجاج نے اس کے ساتھ چھ ہزار منتخب شامی اور عراقی سپاہی کیے، اس کی معیت میں اتنے ہی اونٹوں کے مسلح سوار تھے، تین ہزار اونٹوں پر حربی سامان لادے گئے .... محمد مکران پہنچا تو یہاں کے حاکم محمد ہارون نے اور فوجی سامان اور پانچ منجنیق مہیا کیے، جو دیبل بھیج دیے گئے، ان عرب سپاہیوں

کے علاوہ محمد بن قاسم نے اپنے جھنڈوں کے نیچے ان جاٹوں اور میدیوں کو جمع کیا جو ہندوؤں کی غیر روادارانہ حکومت سے عاجز تھے اور بہت ذلت برداشت کر رہے تھے، وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، ان کو اچھے کپڑے پہننے کی ممانعت تھی، ان کو ننگے سر رہنے کا حکم تھا، ان ذلتوں سے وہ محض لکڑہارے اور پن بھرے بنکر رہ گئے تھے، ان کے دلوں میں ایسا عناد بھرا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی قسمت کو فوراً ایک اجنبی کے سپرد کر دیا۔

(ہسٹری آف مڈیول انڈیا ص ۵۶-۵۵)

عربوں کی عام رواداری

سندھ میں عربوں اور سندھی عربوں کی حکومت ۹۰ھ سے ۴۱۶ھ تک یعنی ۳۲۶ برس تک رہی، اس مدت میں زراعت سندھی باشندوں ہی کے سپرد رہی، کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرنے کیلیے سندھی ہی مقرر کیے جاتے، انکی ملازمت موروثی ہوتی، شروع میں مالگذاری عموماً اتنی ہی وصول کیگئی جو وہ پہلے کرتے آئے تھے، ہندوؤں کے رسم و رواج میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی، ہندوؤں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ انکی پنچائیت میں ہوا کرتا تھا، ہندوؤں کی عبادت گاہیں لڑائی کے زمانے میں تو مسمار ہوئیں یا جن میں بیشمار دولت پوشیدہ رکھی جاتی تھی، انکے خلاف فتح و تسخیر کے سلسلے میں فوجکشی ضروری ہوئی، مگر امن کے زمانے میں انکو وہی درجہ دیا گیا جو اسلامی ممالک میں عیسائیوں کے گرجوں اور آتش پرستوں کے آتش کدوں کو دیا گیا تھا، ڈاکٹر ڈبنی پرشاد لکھتے ہیں :-

ہندوستان میں کسی حکومت کے مقبول ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اسکے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اور عبادت کرنے میں آزادی ہو، ہندوستان کے مسلم حملہ آوروں نے مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا، اور اپنی حکمت عملی اسی کے مطابق بنائی، آٹھویں صدی میں محمد ابن قاسم نے سندھ میں اپنی حکومت کا جو نظم و نسق قائم کیا وہ اعتدال اور رواداری کی روشن مثال ہے۔ (ہسٹری آف جہانگیر۔ (ص ۸۸-۸۹)

(باقی)

شرح السُّنّۃ امام بغوی

از

ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

دفعِ تعارض

بعض حدیثیں بظاہر باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں، مگر علمائے فن اور حدیث کے شارحین نے اس طرح کی حدیثوں میں جمع و تطبیق کی صورتیں بیان کر کے ان کے اختلاف و تناقض کو دور کر دیا ہے، امام بغوی نے بھی حدیثوں کے تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق اور سلام و کلام ترک کرنا مناسب نہیں ہے، اس کے مقابلہ میں بعض ایسی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باطل و خرافات میں ملوث اور دین میں تحریف کرنے والے مسلمانوں سے دائمی قطع تعلق کر لینا چاہیئے، اس طرح کی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

سیکون فی آخر اُمتی اناس یحدثونکم بما لم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم وایاھم،

[illegible]

آخر میں میری امت کے اندر ایسے لوگ ہوں گے، جو تم لوگوں سے ایسی باتیں بیان کریں گے، جن کو تم لوگوں اور تمھارے آبا نے نہ سنا ہوگا،

اسی طرح جب غزوۂ تبوک میں حضرت کعب بن مالکؓ، مرارہ بن ربیعہ اور ہلال بن امیہؓ بلا عذر
شریک نہیں ہوئے، تو رسول اللہ اور صحابۂ کرام نے ان لوگوں کا مقاطعہ کیا، اور پچاس ۵۰ دنوں تک
ان سے کوئی ربط و تعلق نہ رکھا، ان حدیثوں میں بظاہر جو تضاد معلوم ہوتا ہے، امام بغوی نے اس
کو رفع کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"تین دنوں سے زیادہ بے تعلقی کی ممانعت کا تعلق ایسے دو شخصوں سے ہے جن کے درمیان
باہمی معاملات میں خرابی کی وجہ سے کشیدگی واقع ہوگئی ہو، اور ان کی بھائی چارگی ختم ہوگئی ہو؛
لیکن دین کے معاملہ میں کوتاہی اور مداہنت کرنے والوں سے ترک تعلق کرنے پر اس ممانعت
کا اطلاق نہ ہوگا، کیونکہ اہل اہواء اور بدعتوں میں ملوث لوگوں سے تو ہمیشہ کے لئے مقاطعہ
کیا جائے گا، الا آنکہ وہ لوگ توبہ کرلیں، اور بدعت کے ارتکاب اور دین میں مداہنت
سے باز آجائیں، جیسا کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے اصحاب نے کعبؓ اور ان کے دونوں
ساتھیوں سے اس وقت تک تعلقات منقطع رکھے، جب تک کہ وحی الٰہی نے ان لوگوں
کی برأت اور بے گناہی سے آپ کو مطلع نہیں کیا تھا۔"

(جلد اول ص ۲۲۴ تا ۲۲۶)

تعارض کی ایک اور مثال یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں قبر کو مسطح کرنے اور اونچی نہ بنانے کا
ذکر ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے، کہ آپ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کی قبر کو مسطح کرایا تھا،
مگر اس کے برعکس سفیان تمار نے روایت کی ہے، کہ انہوں نے آنحضرت صلعم کی قبر کو غیر مسطح دیکھا تھا
امام بغوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر یہ دونوں روایتیں صحیح و ثابت ہیں، تو ان میں تطبیق اس طرح دی جائے گی
کہ آپ کی قبر پہلے تو مسطح ہی تھی، مگر بعد میں وہ اونچی کردی گئی تھی، چنانچہ ولید بن

عبد الملک اور بعض لوگوں کے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے زمانہ میں
آپ کی قبر میں تبدیلی کی گئی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبروں کے سلسلہ میں اصل حکم
مسطح کرنے کا ہے، اور یہی اولیٰ و احسن بھی ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ
آپ نے جب عثمانؓ بن مظعون کو دفن کیا تو ان کے سرہانے پتھر رکھ کر فرمایا کہ اس کی وجہ
سے میرے بھائی کی قبر جان لی جائے گی، اور ان کے جو متعلقین آئندہ فوت ہوں گے ان
کو انہی کے قریب دفن کیا جائے گا، غرضیکہ قبر کو اونچی اور زمین کی سطح سے بلند بنانا نا
ناپسندیدہ ہے، امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ قبر کو اتنی ہی اونچی کرو کہ جس سے اس
کے قبر ہونے کا پتہ چل سکے تاکہ اس پر نشست و برخاست کی جائے، اور نہ اسے
روندا جائے، یہ مقدار ایک بالشت ہوسکتی ہے، علماء کا بیان ہے کہ قبر کو بھرنے اور
ہموار کرنے کے لئے اور جگہ سے مزید مٹی لانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسی مٹی کو
کو استعمال کرلینا چاہیے، جو کھودتے وقت قبر سے نکلی ہو"

(جلد ۵ ص ۳۰۲، ۳۰۳)

بعض حدیثوں کے الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے، امام بغوی نے اس کی جانب بھی
اعتنا کیا ہے، جیسے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا مجھے لوگوں سے قتال کا حکم
دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں، لیکن بعض اور حدیثوں میں لا الٰہ الا اللہ کے
ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس اختلاف کا ازالہ ملاحظہ ہو،

"حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں "یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ" کا
ذکر نہیں ہے، مگر ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے، امام
خطابی فرماتے ہیں، کہ یہ فرق اختلاف اوقات کا نتیجہ ہے، کیونکہ دین کے احکام

فرائض مختلف وقتوں میں یکے بعد دیگرے فرض کئے گئے ہیں، پس پہلی (حضرت ابوہریرہؓ کی) حدیث ان فرائض کے وجوب سے پہلے کی ہے، اور ابن عمرؓ اور انسؓ کی حدیثیں ان فرائض کے وجوب کے بعد کی ہیں، اس لئے ان میں نماز و زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے"۔ (جلد اول ص ۶۸، ۶۹)

اعتقادی وکلامی مباحث

عباسی دور میں یونانی منطق و فلسفہ کی جب نشر و اشاعت ہوئی تو مسلمان فلسفہ و کلام کی غیر ضروری بحثوں میں پڑ کر دین کی حقیقت اور اس کی اصلی روح سے دور ہونے لگے، اور ایمان و راسخ العقیدگی شک و تذبذب میں تبدیل ہونے لگی، اس موقع پر محدثین کی جماعت اُن کی صحیح رہنمائی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، اور اس نے اُن کے ایمان واعتقاد کو مستحکم رکھنے کے لئے ایمانیات وعقائد میں بحث وتدقیق اور فلسفہ و کلام میں غور وخوض کی شدت سے مخالفت کی، امام بغوی نے بھی اپنے پیشرو محدثین کی طرح ان مباحث میں پڑنے کو غیر ضروری اور ان میں سکوت کو افضل بتایا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"علمائے اہل سنت صفاتِ الٰہی میں بحث اور علم کلام سیکھنے اور اس میں بحث و تفتیش کرنے کی ممانعت پر متفق ہیں، ...... امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ لوگو بدعتوں سے بچو، اُن سے دریافت کیا گیا، کہ بدعتیں کیا ہیں؟ ارشاد ہوا کہ اہل بدعت وہ ہیں جو خدا کے ناموں، اس کی صفتوں، اس کے کلام، اس کے علم اور اس کی قدرت کے بارہ میں بحث و گفتگو کرتے ہیں، اور ان چیزوں میں خاموشی نہیں اختیار کرتے جن میں صحابۂ کرام اور تابعین عظام نے سکوت اختیار کیا تھا، ..... سفیان ثوری سے جب کلام کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ باطل سے اجتناب کرو، بدعتیں چھوڑ دو، اور سنتوں کی پیروی کرو"[1]

[1] جلد اول ص ۲۱۶

ایک حدیث میں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے، کہ ان اوقات میں سورج شیطان کی دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے، اور زوال کے وقت نماز پڑھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس وقت جہنم کی آگ بھڑکائی جاتی ہے اور اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں امام بغوی فرماتے ہیں:-

"ان اسباب و علل کی حقیقت و ماہیت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، ہمارے لئے ان پر ایمان لانا اور اُن کی تصدیق کرنا تو ضروری ہے، مگر اُن میں غور و خوض سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے"۔ (جلد سوم - ص ۳۳۰)

کلامی مباحث سے اس قدر بیزاری کے باوجود بعض اور محدثین کی طرح امام بغوی کو بھی ضرورتاً اپنے زمانہ کے حالات کی وجہ سے ان سے یک گونہ تعرض کرنا پڑا ہے، تاہم اس طرح کے مسائل میں ان کے خیالات کتاب و سنت کے ظاہر کے مطابق اور احتیاط پر مبنی ہیں، اور انھوں نے ان امور کے بارہ میں اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے، اس کی بعض مثالیں اس لئے قلمبند کی جاتی ہیں، کہ ان سے اُن کے اعتقادی مسلک کا اندازہ ہوگا،

اعتقادی و کلامی بحثوں میں خلق قرآن کا مسئلہ نہایت اہم ہے، فرقۂ معتزلہ نے اپنے دورِ عروج میں اس کی جس قدر پُرزور تائید کی تھی، اسی قدر محدثین اور علمائے حق نے اس کا پُرزور رد بھی کیا تھا، محدثین و فقہاء کے سرخیل امام احمد کو اسی وجہ سے سخت زد و کوب کیا گیا تھا، امام بغوی نے خلق قرآن کے رد میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، اس میں پہلے متعدد آیتیں نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ قرآن اللہ کا کلام، اس کی وحی و تنزیل اور صفت ہے، وہ نہ خالق و مخلوق ہے، اور نہ محدث و حادث، ان آیتوں کے بعد وہ یہ روایت درج

کرتے ہیں کہ "قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آج کی رات مجھے نیند نہ آئی، آپ نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا مجھے ایک بچھو نے ڈنک مار دیا تھا آپ نے فرمایا کہ "اگر تم نے شام ہی کو یہ کہہ دیا ہوتا

اَعوذ بکلمات اللہ التامات — میں مخلوقات کے شر سے اللہ کے کامل و

مِنْ شرِ ماخلق، — تام لفظوں کی پناہ میں آتا ہوں،

تو انشاء اللہ تمھاری تکلیف زائل ہوگئی ہوتی اس کے ضمن میں امام بغوی لکھتے ہیں، :-

"یہ اور اس طرح کی وہ تمام حدیثیں جن میں کلماتِ الٰہی سے استعاذہ کا ذکر ہے، اس امر کی دلیل ہیں کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ کا کسی مخلوق سے استعاذہ ثابت نہیں ہے، البتہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے کلام سے اسی طرح استعاذہ کیا ہے جس طرح خود اس سے کیا ہے، قرآن مجید میں اللہ سے استعاذہ کا ذکر متعدد مواقع پر آیا ہے :-

اعوذ بک من ھمزات الشیاطین — اے خداوندا! میں شیطانوں کے

واعوذ بک رب ان یحضرون، — وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں

(مومنون، ۹۷و ۹۸) — اور اس بات سے بھی کہ وہ میرے پاس آئیں،

دوسری جگہ ہے :-

قل اعوذ برب الفلق، — کہو کہ میں صبح کے خداوند کی پناہ

(فلق - ۱) — مانگتا ہوں،

تعوذ کے الفاظ ہیں، :-

اعُوذ باللہ مِنَ الشّیطانِ الرّجیم، — میں ملعون شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں،

اسی طرح آپ نے خدا کی صفتوں سے بھی استعاذہ کیا ہے، ایک حدیث میں ہے :-

قُل اعوذ بعزۃ اللہ وقدرتہ — کہو کہ میں تمام چیزوں کے شر سے

من شر ماجد، — اللہ کی عزت و قدرت کی پناہ میں آتا ہوں،

لیکن آپ نے کسی مخلوق سے کبھی استعاذہ نہیں کیا، اسی لئے امام احمدؒ (اعوذ بکلمات اللہ التامات) سے استدلال کرتے تھے، کہ قرآن مجید مخلوق نہیں ہے کیونکہ کوئی مخلوق بھی نقص سے خالی اور کامل نہیں ہے،

امت کے سلف اور علمائے سنت کا مسلک یہی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اس کی وحی ہے، وہ خالق و مخلوق نہیں، خلقِ قرآن کا عقیدہ بدعت و ضلالت ہے، صحابہ و تابعین کے زمانہ میں کوئی اس کا قائل نہ تھا، یہ جعد بن درہم کی ایجاد ہے، اس نے یہ عقیدہ ظاہر کر کے اہلسنت والجماعت کی مخالفت کی تھی، خالد بن عبداللہ قسری نے اسی کی پاداش میں اسے قتل کر دیا تھا، اس کے بعد فرقۂ جہمیہ کے بانی جہم بن صفوان نے اس نظریہ کی اشاعت کی،

سفیانؒ بن عیینہ عمرو بن دینارؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم اپنے شیوخ سے ستر سال سے یہ سنتے آئے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اہلِ بیت کے امام جعفر بن محمد صادقؓ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اس بارہ میں وہی کہتا ہوں جو میرے آبا و اجداد کہا کرتے تھے، کہ قرآن خالق و

مخلوق نہیں، بلکہ کلام الٰہی ہے"[1]

مسئلۂ صفات میں انھوں نے کئی جگہ اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، چنانچہ ایک حدیث ہے
کہ انسانی قلوب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں" اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:۔

"انگلی (اصبع) اللہ عزوجل کی ایک صفت ہے، اس طرح کی اور صفتوں کا بھی
قرآن و حدیث میں ذکر ہے جیسے نفس (ذات) وجہ (چہرہ) عین (آنکھ) ید (ہاتھ)
رجل (پاؤں) اتیان ومجی (آنا) نزول الی السماء الدنیا (دنیوی آسمان کی طرف
اترنا) استواء علی العرش (تخت پر متمکن ہونا) ضحک (ہنسنا یعنی راضی ہونا) اور
فرح (خوش ہونا یعنی پسند کرنا) وغیرہ۔

ان سب صفتوں پر ایمان لانا، ان کو ان کے ظاہر پر محمول کرنا، اور
ان کی تاویل و تشبیہ سے بچنا، اور یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی صفتیں
مخلوق کی صفتوں کے مانند نہیں ہیں جس طرح کہ خود اس کی ذات مخلوقات کی
ذاتوں کے مشابہ نہیں ہے،

لیس کمثلہ شئ وھو السمیع — اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں، اور
البصیرہ (شوریٰ ۔ ۱۱) — وہ سننے، دیکھنے والا ہے،

ان سب صفتوں پر ایمان لانا، ان کو قبول کرنا اور ان کی تاویل و توجیہ اور
تمثیل و تشبیہ سے اجتناب کرنا، علماء سلف اور اہل سنت کا معمول تھا، وہ
اُن کی حقیقت معلوم کرنے کے بجائے ان کا علم اللہ کے حوالے کرتے ہیں:۔

والراسخون فی العلم یقولون — اور راسخ علم والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر

[1] جلد اول ص ۱۸۵ تا ۱۸۷

آمنا بہ کل من عند ربنا، — ایمان لائے، سب ہمارے رب
(آل عمران ۔ ۷) — کی جانب سے ہے،

سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے جو اوصاف قرآن مجید میں بیان
کئے ہیں، اُن کی قرأت و تلاوت پر اکتفا اور تاویل میں خاموشی اختیار کی جائیگی،
کیونکہ اُن کی تفسیر و تاویل کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہے، امام مالکؒ
سے الرحمٰن علی العرش استوی (طٰہٰ ۔ ۵) (خدائے رحمٰن تخت پر متمکن ہوا)
کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ استواء کی حقیقت نامعلوم، اور اس کی
کیفیت مجہول ہے، البتہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے، مگر اس کے متعلق سوال
و تفتیش بدعت ہے، ان سے اور امام اوزاعیؒ و سفیان بن عیینہؒ سے رویت
و صفات الٰہی سے متعلق حدیثوں کے بارہ میں دریافت کیا گیا، تو ان لوگوں
نے جواب دیا کہ ان کو اسی طرح ماننا اور تسلیم کر لینا چاہئے، جس طرح یہ بیان
ہوئی ہیں، لیکن ان کی کیفیت و حقیقت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہئے،
زہری سے منقول ہے کہ اللہ کے ذمہ ان صفتوں کی وضاحت، رسول کے
ذمہ اُن کو پہنچانا، اور ہمارے ذمہ ان کو ماننا ہے"،

(جلد ۱ ۔ ص ۱۶۸ تا ۱۷۱)

اسی طرح ایک جگہ اللہ کی صفاتِ ضحک اور فرح کے متعلق لکھتے ہیں، کہ ان کی بندوں
کی صفاتِ ضحک و فرح سے کوئی نسبت نہیں ہے، بلکہ اُن سے اس کی پسندیدگی اور رضا کا اظہار
مقصود ہے، متقدمین اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ مخلوق کی صفتوں سے منزہ ہے،

(جلد ۵ ص ۸۸)

مسئلۂ خلافت اور خلفائے راشدین کے درجہ و مرتبہ کے بارے میں ان کا وہی مسلک ہے[1] جو اہلسنت والجماعت کا ہے، چنانچہ مندرجۂ ذیل حدیث:۔

فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین،	سو تم لوگوں پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرنا ضروری ہے،

کے تحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس سے خلفائے راشدین (ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم) کی جملہ صحابہ پر فضیلت و برتری ظاہر ہوتی ہے، یہ لوگ انبیاء کرام کے بعد تمام لوگوں سے افضل ہیں، اور باہم فضیلت میں ان بزرگوں کی وہی ترتیب ہے، جو خلافت میں ہے یعنی سب سے افضل تو حضرت ابوبکرؓ ہیں، پھر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ ہیں۔[1]

رسول اللہؐ نے جس طرح تمام صحابہ میں خلفائے راشدین کو افضل قرار دیا ہے اسی طرح خلفاء میں شیخین کو افضل بتایا ہے، چنانچہ حضرت ابو حذیفہؓ سے مروی ہے کہ:۔

اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر وعمر، (جلد اول ص ۲۰۸)	میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کرو،

[1] ایک جگہ امام ثوری کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "جو شخص حضرت علیؓ کو شیخین سے افضل و مقدم سمجھتا ہے، وہ گویا مہاجرین و انصار کی عیب جوئی کرتا ہے، جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اس کے بارہ میں مجھے خطرہ ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی اس کے لئے مفید نہ ہوگا،" (جلد اول ص ۲۲۹)

تفسیری بحثیں

امام بغوی فقہ وحدیث کی طرح تفسیر میں بھی مکمل دستگاہ رکھتے تھے، فن تفسیر میں اُن کی ایک مستقل تصنیف ہے شرح السنة سے بھی اُن کے تفسیر میں کمال کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے اکثر ابواب آیاتِ قرآنی سے مزین ہیں، اور شرح میں بھی بطور استدلال آیتیں نقل کی گئی ہیں، اور کہیں کہیں حقائق و نکات بھی بیان کئے گئے ہیں، بعض ابواب کے شروع میں جو آیتیں نقل کی گئی ہیں، اُن میں بعض کی مختصر تشریح و وضاحت کی گئی ہے، مثلاً عذابِ قبر کے باب میں حسب ذیل آیتیں مختصر تشریح کے ساتھ درج ہیں:۔

وحاق بآل فرعون سوء العذاب النار یعرضون علیها غدوا وعشیا، (مومن - ۴۵)	اور فرعونیوں کو بُرے عذاب نے گھیر لیا - آگ کہ اس پر وہ لوگ صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں،

اس آیت میں بتایا گیا ہے، کہ فرعون اور اُس کے لاؤ لشکر کو غرق کئے جانے کے بعد صبح و شام عذاب دیا جاتا ہے، پھر فرمایا:۔

ویوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون اشد العذاب، (مومن ۴۷)	اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر سخت عذاب میں ڈالو،

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز آل فرعون کو عالم برزخ اور قبر کے عذاب سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا، دوسری جگہ ہے:۔

ولو تری اذ الظالمون فی	اور اگر تم دیکھ پاتے، اس وقت کو

عمرات الموت والملائکۃ باسطوا	جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں
ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم	میں ہوں گے، اور فرشتے ہاتھ بڑھائے
تجزون عذاب الھون بما	ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی
کنتم تقولون علی اللہ غیر	جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا
الحق وکنتم عن ایاتہ تستکبرون	عذاب دیئے جاؤ گے، بوجہ اس کے
(انعام - ۹۳)	کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے، اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کر رہے تھے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج (قبر میں) بھی ظالموں اور گنہگاروں کو عذاب دیا جائے گا۔

"معیشۃ ضنکا (طٰہٰ - ۱۲۴)

کی تفسیر عذاب قبر بھی کی گئی ہے، (جلد پنجم ص ۱۴۲)

قرآن مجید اور بعض حدیثوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "سبع مثانی" عطا کئے جانے کا ذکر ہے، اس کی تفسیر و وضاحت میں رقمطراز ہیں،

"سبع مثانی سے سورہ فاتحہ مراد ہے، جو سات آیتوں پر مشتمل ہے، اس کو مثانی اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ نماز کی ہر ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سورہ چونکہ صرف امت مرحومہ کے لئے مستثنیٰ و مخصوص کی گئی؟ اور گذشتہ قوموں کو نہیں عطا کی گئی تھی، اس لئے اس کو مثانی کہا گیا ہے تیسرا قول یہ ہے کہ حمد و ثنا کے مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مثانی کہلائی؟

ایک قول یہ ہے کہ مثانی سے مکمل قرآن مراد ہے کیونکہ خود اس میں مذکور ہے،

اللہ نزل احسن الحدیث کتابا	اللہ نے بہترین کلام اتارا، ایسی کتاب
متشابھا مثانی،	جو باہم دگر مشابہ اور بار بار دہرائی گئی ہے،
(زمر - ۲۳)	

یہاں مکمل قرآن کو مثانی کہا گیا ہے، کیونکہ اس کے اندر امثال و قصص دہرا کر بار بار بیان کئے گئے ہیں، پس حدیث نبوی (انھا السبع من المثانی) کا مطلب یہ ہوگا کہ فاتحہ جو سات آیتوں والی سورہ ہے، مجموعہ قرآن میں سے ہے، مثانی سے وہ سورتیں بھی مراد لی گئی ہیں جن کی آیتیں دو سو سے کم اور مفصلات سے زیادہ ہیں، اس صورت میں گویا ان سورتوں کو مثانی مئین (دو سو آیتوں والی سورتوں) کے مقابلہ میں کہا گیا ہے جن کی حیثیت مبادی کی اور ان مفصل ان سورتوں (دو سو سے کم والی کی حیثیت مثانی کی ہے" (جلد چہارم ص ۴۴۷، ۴۴۸ و ۴۴۹)

سورہ آل عمران میں قرآن مجید کی آیتوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں، (۱) محکمات، (۲) متشابہات، مصنف ان کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"مجاہد نے محکمات سے اُن آیتوں کو مراد لیا ہے جن میں حلال و حرام (احکام و مسائل) کا ذکر ہے، اور متشابہات کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتیں بعض آیتوں کی تصدیق کرتی ہیں، جیسے مندرجہ ذیل آیتیں ایک دوسرے کے مفہوم کی مؤید ہیں،

وما یضل بہ الا الفاسقین،	اور وہ اس (قرآن کے ذریعہ گمراہ نہیں
(بقرہ - ۲۶)	کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنیوالے ہیں

اور :-

ویجعل اللہ الرجس علی الذین لا یعقلون ، (یونس - ۱۰۰)	اور اللہ گندگی (گمراہی) کو ان لوگوں پر ڈالتا ہے ، جو عقل سے کام نہیں لیتے ،

نیز :-

والذین اھتدوا زادھم ھدی ، (محمد - ۱۷)	اور جو لوگ عقل کی راہ اختیار کرتے ہیں ، اللہ اُن کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے ،

دوسرا قول یہ ہے کہ محکمات سے غیر منسوخ آیتیں مراد ہیں ، چنانچہ ارشاد ربانی ہے :-

تلک ایات الکتاب الحکیم (یونس)	یہ محکم کتاب کی آیتیں ہیں ،

دوسری جگہ فرمایا :-

کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت ، (ھود - ۱)	یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں (پہلے) محکم کی گئیں ، پھر اُن کی تفصیل بیان کی گئی ،

محکم کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایسی آیتیں جن کے معنی بالکل ظاہر اور واضح ہوں ، اور متشابہ کے بارہ میں متعدد اقوال ہیں ، امام خطابی اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ جن آیتوں کا مفہوم ان کے ظاہری الفاظ سے واضح نہ ہو ، وہ متشابہ ہیں ، اُن کی دو قسمیں ہیں ، (الف) وہ جن کا مفہوم محکم کی جانب رجوع کرنے کے بعد واضح ہو جائے ، (ب) جن کی حقیقت اور تاویل سے واقفیت کی کوئی صورت ہی نہ ہو ، اور سوائے اللہ کے ان کی تاویل کوئی نہ جان سکتا ہو جن

لوگوں کی سرشت میں کجی ہوتی ہے ، وہی اس طرح کی آیتوں کی تاویل کے درپے ہوتے ہیں ، جیسے تقدیر ، مشیت اور صفات الٰہی سے متعلق آیتیں جن کی حقیقت معلوم کرنے کا ہم کو مکلف نہیں کیا گیا ہے ، اور نہ ان کے اسرار ہم پر منکشف کئے گئے ہیں ، اس طرح کی آیتوں کی ٹوہ میں پڑنے والا فتنہ کا متلاشی ہوتا ہے[1]

(جلد اول ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

---

[1] مصنف کی بعض توجیہات محل نظر ہیں ، محکمات و متشابہات کا معاملہ چونکہ نہایت مہتم بالشان ہے ، اس لئے ان کے متعلق محقق و مرجح قول بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ، محکمات سے دراصل وہ آیتیں مراد ہیں جو بدیہیات و قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہوتی ہیں ، ان کو قبول کرنے میں کبھی عقل کو تردد اور تامل نہیں ہوتا ، بلکہ ہر قلب سلیم رکھنے والا شخص اُن کو تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے ، جیسے توحید و معاد کے نظری دلائل و شواہد اور خیر و شر اور معروف و منکر کے مسلمات وغیرہ (بقیہ حاشیہ ص) رہیں ، متشابہات تو ان سے وہ آیتیں مراد ہیں ، جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کی دسترس سے باہر کی باتیں قرآن نے تشبیہی و تمثیلی رنگ میں بیان کی ہیں ، یہ باتیں جس بنیادی مسئلہ اور حقیقت سے تعلق رکھتی ہیں ، وہ بجائے خود تو واضح ہوتی ہیں ، مگر چونکہ اُن کا نادیدہ عالم سے تعلق ہوتا ہے ، اس وجہ سے قرآن اُن کو تشبیہ و تمثیل کے پیرایہ میں پیش کرتا ہے ، تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں ، اور اُن کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کر دیں ، خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور آلام سے متعلق جو آیتیں ہیں ، وہ متشابہات کہلائیں گی ،

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی گوپاموی ایم اے سابق لکچرار شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حضرت مولانا الحاج سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ محلہ مرواد قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، جہاں حضرت یحییٰ منیریؒ کا مزار پُر انوار ہے، مولانا مرحوم و مغفور کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی کچھوچھوی قدس سرہٗ کے بھانجے حضرت سید عبدالرزاق جیلانی حسنی حسینی سے ملتا ہے، جو اب حضرت مخدوم سمنانی کی طرف منسوب ہو کر اشرفی کہلاتا ہے۔ اسی سلسلے کے خاندان کی ایک شاخ دلی میں بھی تھی جو اب پیر الٰہی بخش کالونی کراچی پاکستان میں ہے۔

مولانا ممدوح کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی تعلیم کا حال معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اپنے اعمام (محترم/احمد) سے جو سب کے سب عالم و فاضل تھے، تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جونپور تشریف لا کر حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم کے درس میں شریک ہوئے اور ان ہی سے سند فراغت حاصل کی، ممدوح کو اپنے استاذ مرحوم سے غیر معمولی تعلق تھا۔

مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم خیرآبادی سلسلہ کے نامور اور ممتاز شاگرد اور براہ راست علامہ فضل حق خیرآبادی مرحوم سے مستفیض تھے، مولانا سید سلیمان اشرفؒ کا برتاؤ و اکرام میرے ساتھ علاوہ شاگردی اور ماتحتی کے اسی خیرآبادی سلسلہ کا فیضان تھا،

فروری ۵۵ء

کیونکہ حضرت شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ کی پھوپھی زاد بہن کا میں نواسہ تھا، یہ نسبت حضرت مولانا ممدوح کی بارگاہ میں میری بھی عزت کا باعث تھی۔

مولانا ممدوح علی گڑھ کے مشہور دار العلوم میں بحیثیت معلم دینیات اس زمانے میں ملازم ہوئے جب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں صاحب اس کے آنریری سکریٹری تھے، آپ کو علی گڑھ لانے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، اس زمانہ میں دار العلوم میں ممتاز علماء کا مجمع تھا، جن میں مولانا خلیل احمد اسرائیلی، مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا رشید احمد، مولانا عبدالحق حقی، شمس العلماء مولانا عباس حسین مجتہد، موخر الذکر نہ صرف شعبۂ دینیات کے معلم بلکہ ایم اے کو عربی کورس بھی پڑھایا کرتے تھے، انھوں نے بحالت ملازمت طویل عمر گذار کر علی گڑھ ہی میں انتقال کیا۔

مولانا ممدوح کے تعلقات و روابط اپنے معاصرین سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں اور حکام دار العلوم سے ہمیشہ خوشگوار رہے، ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی بن جانے کے بعد جب مرحوم کا مرتبہ اور عہدہ دونوں بڑھ گئے تھے، اس میں کوئی فرق نہ آیا، اور وہ شعبۂ دینیات کے صدر اور لیڈر ہو گئے تھے، یونیورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر مہاراجہ محمود آباد تھے، یہ خدمت عرصہ دراز تک اعزازی رہی، اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر اور ریاضی کے ماہر اور کیمبرج کے فاضل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پرو وائس چانسلر ہوئے، حضرت مولانا مرحوم اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب میں "اسلامک اسٹڈیز" کے مسئلہ میں اختلاف ہو گیا، جس نے بہت طول کھینچا اور دونوں میں آخر تک کشیدگی رہی۔

مولانا مرحوم و مغفور اپنے استاد زادوں کی بڑی خدمت کرتے تھے، اپنے استاد کے داماد کو اپنی ماتحتی میں ملازمت دلوائی، ان کے بیٹے کی تعلیم کے کفیل ہوئے اور میٹرک پاس کرانے کے بعد

ان کو یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت دلوائی، وہ مرحوم کے ساتھ ہی رہتے تھے، اور باوجود ملازم ہوجانے کے کفالت حسب سابق جاری رہی،

مولانا مرحوم نے آخر عمر میں محض بہ اتباع سنت نبویہ اور اپنی والدۂ مرحومہ کے حکم کی تعمیل میں شادی بھی کرلی تھی، جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور اہلیۂ محترمہ شادی کے چند سال بعد مرگئیں، مولانا مرحوم اپنے بھانجے سید معین کے بھی کفیل تھے، ان کو ایل ایل بی تک تعلیم دلوائی، سید معین سشن جج کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے، مولانا مرحوم کے ایک بڑے بھائی تھے، جن کو ممدوح نے مرتے دم تک اپنے پاس رکھا، وہ پولیس کے محکمے میں آفیسر تھے، دماغی توازن خراب ہوگیا تھا، اچھے پڑھے لکھے تھے، وہ کسی سے نہ بولتے تھے اور نہ کسی کو ستاتے تھے، یونیورسٹی لائبریری جاکر کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہوجاتے، حضرت مولانا مرحوم نے جیسی انکی خدمت کی اسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مولانا مرحوم کو تدریس وتحریر اور تقریر پر غیر معمولی قدرت و مہارت حاصل تھی، ان کی تصانیف میں المبین نامی کتاب نے علمی حلقوں میں کافی قبولیت حاصل کی، یہ عربی زبان کی فضیلت پر ہے، ہندوستانی اکیڈمی نے اس پر انعام بھی دیا تھا، خود مرحوم نے اس کی عمدہ کتابت وطباعت پر شروانی پریس کے مالک مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی مرحوم کو انعام دیا تھا، دوسری کتاب حج کا سفرنامہ ہے جو بے حد مفید ہے، تیسری کتاب اس سوسائٹی سے متعلق ہے جو "خسرو سوسائٹی" کے نام سے نواب اسحاق خاں مرحوم نے جب وہ سکریٹری تھے، دار العلوم میں قائم فرمائی تھی، اور جس کی غایت یہ تھی کہ حضرت امیر خسرو کے پنج گنج جو ممدوح قدس سرہٗ العزیز نے "خمسۂ نظامی" کے جواب میں لکھا تھا مثلاً ہفت پیکر کے جواب میں ہشت بہشت وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کی مبسوط شرح لکھی جائے، چنانچہ ایک ایک مثنوی کو دار العلوم کے علماء پر تقسیم کردیا تھا، مولانا مرحوم ومغفور کے حصہ میں ہشت بہشت آئی جن حضرات نے ان تقابلی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے

وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ مثنوی ہفت پیکر اور ہشت بہشت کا تقابلی تبصرہ نہ صرف مولانا ممدوح کی علمی فضیلت کا مظہر بلکہ ان کے صوفیانہ مسلک کا بدرجۂ اتم ترجمان ہے، کیونکہ دونوں مثنویاں تصوف میں ہیں،

میں نے اسی تقابلی تصنیف کی مدد سے ایم اے کے طلبہ کو درس بھی دیا تھا، پہلی بار ایم اے میں یہ پانچواں پرچہ رکھا گیا تھا جس کی تدریس میرے سپرد کی گئی، اور اس پرچہ کا پہلی بار میں ہی ممتحن بھی ہوا تھا، حضرت مولانا مرحوم ومغفور نے ترک موالات کے دور میں اسلامی نظریہ کی تائید میں تین رسالے تالیف کیے، پہلا الرشاد، دوسرا البلاغ اور تیسرا النور، آخری رسالہ ضخیم اور کافی مدلل ہے، اسلامک اسٹڈیز کے مسئلہ پر بھی آپ نے مبسوط ومدلل کتاب لکھی جو نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم وائس چانسلر کے حکم سے بڑے اہتمام سے چھپاکر شائع کی گئی۔

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم ومغفور کے علم وفضل کا اندازہ وہ لوگ خوب کرسکتے ہیں جنھوں نے ممدوح سے درس لیا، یا ان کے مواعظ حسنہ سنے، ان کا وعظ سیدھے سادے الفاظ میں تصنع، تکلف اور لفاظی کے بغیر بڑا دلکش ہوتا تھا، مرحوم جمعہ کو عصر ومغرب کے درمیان یونیورسٹی کی مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، جس میں ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی، مرحوم ومغفور کی خوش بیانی نہایت دلکش ہوا کرتی تھی، آپ صرف تین جگہوں پر وعظ فرمایا کرتے تھے، ایک اجمیر شریف کے عرس میں درسگاہ شریف کے مدرسہ میں، دوسرا ربیع الاول میں دہلی میں خان بہادر سید بہاء الدین مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر کے یہاں، تیسرا الہ آباد میں ایک تمباکو فروش تاجر کے یہاں ان کے علاوہ کہیں وعظ نہ فرماتے تھے، جب کوئی وعظ کی فرمائش کرتا تو جواب میں فرماتے کہ ہمارا کھاتہ تو تین جگہ ہے، اس کے علاوہ ہم وعظ نہیں کہتے، ہم مدرس ہیں، واعظ نہیں،

ایک مرتبہ علی گڑھ کے رئیس جو اکثر حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے،

اپنی نیازمندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے درخواست کی کہ مولانا ان کے گھر پر وعظ فرمائیں، حضرت ممدوح نے وہی جواب ان کو بھی دیا جو اوپر درج ہوا۔

مولانا مرحوم ومغفور کا اخلاق بے مثال تھا، لیکن خودداری اور عزت نفس کے ساتھ، جو کسی زمانے میں شرافت کا معیار اور اس کا جزء اعظم تھا، اس کو ممدوح نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، میرے نزدیک مولانا اُن ممتاز علماء میں تھے جنھوں نے دنیائے انسانیت کو یہ سبق دیا تھا کہ علمائے دین اور پیشوایان شرع متین کی کس طرح عزت کیجائے، یہ حضرت ہی کی خودداری کا طفیل تھا کہ علی گڑھ نے علماء کے احترام کا سبق سیکھا اور وہاں علماء کا وقار قائم رہا، جو اب تقریباً ہر جگہ مفقود ہے، جس میں میری رائے میں نام نہاد علماء کا بھی قصور ہے، مولانا ممدوح کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی بڑے آدمی کے گھر نہیں گئے، سر راس مسعود (مسعود جنگ) جو نہ صرف وائس چانسلر تھے، بلکہ جنھوں نے جدید تنظیمی کمیشن تشکیل کرکے یونیورسٹی کی دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا تھا، مولانا مرحوم نے ان کے یہاں بھی کبھی حاضری نہیں دی، علی گڑھ کی سلور جوبلی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی، باہر سے بڑے بڑے مہمان آکر شریک ہوئے، لیکن مولانا اپنے چبوترے سے جس پر شام کو احباب کے ساتھ نشست فرماتے تھے، نہیں اترے، حالانکہ جلسہ حضرت کی نشست گاہ اور کمرہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا بلکہ شرکائے جلسہ خود بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوئے،

مولانا مرحوم کا طریقۂ درس بالخصوص دار العلوم میں جہاں دینیات کی تدریس محض امتحان پاس کرانے کے لیے تھی، بہت پسندیدہ اور دلکش تھا، نصاب تعلیم اس دلنشین انداز میں پڑھاتے تھے کہ طلبہ بڑی تعداد میں کامیاب ہوتے تھے،

میں ۱۹۲۴ء میں پہلے انٹرمیڈیٹ کالج میں دینیات کا لکچرر مقرر ہوا، چند مہینوں کے بعد مجھے حضرت مولانا کی تحریک پر بی ایس سی اور ایف ایس سی کے طلبہ کو دینیات پڑھانے

کے لیے مقرر کر دیا گیا، یہاں یونیورسٹی کے سائنس کے طلبہ کو دینیات اور اردو بھی پڑھاتا تھا، شعبۂ دینیات میں جب B.T.H اور M.T.H کے درجات کھولے گئے تو B.T.H کا تفسیر کا پرچہ مجھے پڑھانے کے لیے دیا گیا، میرے طریقۂ درس کی حضرت مولانا نے غیر معمولی تحسین فرمائی، ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پرو وائس چانسلر کا اصول تھا کہ وہ تدریس کے لیے کسی اہل آدمی کو صدر شعبہ کے مشورہ سے منتخب کر لیا کرتے تھے، شعبہ کی قید کے پابند نہ تھے، ان کے مستعفی ہونے کے بعد جب شعبۂ دینیات کی جدید تنظیم ہوئی تو یہ آزادی ختم کر دی گئی، ایک شعبہ کا مدرس دوسرے شعبہ میں کام نہیں کر سکتا تھا، مولانا مرحوم نے اپنے شعبہ کیلئے میرا انتخاب فرمایا اور شعبۂ دینیات کا کل کام میرے سپرد کر دیا، شعبہ میں تین آدمی تھے، میں لکچرر، مولانا ابو بکر محمد شیث فاروقی جونپوری ناظم دینیات اور حضرت مولانا ریڈر اور صدر شعبہ تھے،

امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا مولانا کا اصول طلبہ کے لیے غیر معمولی معاون تھا، حالانکہ طلبہ کے حلقہ میں مشہور تھا کہ مولانا مرحوم کاپی جانچنے میں سخت ہیں، جو واقعہ کے برعکس تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، ایک مرتبہ ایف اے اور ایف سی کے طلبہ کے امتحان کی تقریباً پانچ سو کاپیاں جانچنے کے لیے مولانا کے پاس آئیں، مولانا نے مجھکو بلا کر فرمایا "مولانا میں آپ کو ایک تکلیف دیتا ہوں وہ یہ کہ پانچسو کاپیاں آپ دیکھکر نمبر دیدیجئے، میں نے عرض کیا کل انشاء اللہ دیکھ لونگا، دوسرے روز دوپہر کو ظہر کی نماز کے وقت تک سب کاپیاں میں نے دیکھ ڈالیں، اور نمبر دیکر کاپیاں قاعدے سے رکھکر ان کے بیدار ہونے سے پہلے چلا آیا، عصر کے وقت مجھسے پوچھا، میں نے عرض کیا کہ کاپیاں دیکھکر نمبر دیدیے ہیں، حیرت سے فرمایا کہ کتنے فیل ہوئے، میں نے عرض کیا تینتیس ۳۳، فرمایا یہ تعداد بہت زیادہ ہے، اور فرمایا کہ مولانا یہاں طلبہ دینیات پڑھنے کے لیے نہیں، بلکہ گریجویٹ ہونے کے لیے آتے ہیں کہ روزی سے لگ جائیں، اگر اتنی تعداد امتحان میں ناکام ہوگئی تو

پورے امتحان میں ناکام سمجھے جائیں گے، اس لیے دوبارہ کاپی جانچیے اور جس طالب علم کو دس نمبر ملے ہوں اس کو کامیاب کر دیجئے، چنانچہ دوسرے روز میں نے اسی اصول پر دوبارہ کاپیاں دیکھیں اور عرض کیا کہ اب صرف پندرہ طلبہ ناکام ہیں، فرمایا یہ تعداد بھی زیادہ ہے، زیادہ سے زیادہ پانچ طلبہ فیل ہونے چاہئیں، میں نے عرض کیا کہ ان پندرہ کی کاپیاں آپ خود ملاحظہ فرما کر نمبر دیدیں، اب میں ان کو نہیں دیکھوں گا، چنانچہ ممدوح نے خود دیکھ کر پانچ کو ناکامیاب رکھا، اور باقی کو کامیاب کر دیا، یہ تھا حضرت مولانا کا طالب علموں کے ساتھ ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ،

حضرت ممدوح کے خصائل اور کردار کی چند مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں، جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے،

آپ کی بے خوفی اور بے باکی بے مثال تھی، وہ کسی کے علم و دولت کے آگے جھکنا جانتے ہی نہ تھے، لیکن اہل فضل و کمال کی بڑی قدر کرتے تھے، علم دین نے ان کو مجسم خلق اور انسانی خوف سے بے نیاز کر دیا تھا، مزاج میں انتہا درجہ کی نفاست تھی، کھانا اچھا کھاتے تھے، مگر قلیل مقدار میں، لباس کا بڑا اہتمام تھا، خاص طور پر جمعہ کے دن بہت چوڑی آستین کا لباس زیب تن کرتے تھے،

لباس کے سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے، ایک روز جاڑوں کے موسم میں نواب سر مزمل اللہ خاں رئیس بھیکم پور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی "بارگاہ سلیمانی" میں حاضر ہوئے، اس وقت موصوف روسی پوستین پہنے ہوئے تھے، موٹر سے اتر کر علیک سلیک کے بعد نواب صاحب نے کہا کہ یہ پوستین میں نے روس سے منگوایا ہے، حضرت ممدوح نے پوستین کی تعریف کے ساتھ انکی امارت کی بھی توصیف کر دی، تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب چلے گئے، دوسرے روز حضرت مولانا نے روس سے ایک پوستین کی فرمائش بھیجدی، دوسرے مہینے ہی پوستین آگئی، حضرت ممدوح اسکو پہنکر نواب صاحب مرحوم کے پاس گئے، اور ان کو پوستین دکھا کر فرمایا کہ میں نے اسکو روس سے

منگوایا ہے، نواب صاحب تعریف کر کے خاموش ہو گئے، مولانا مرحوم کے پاس شیروانیاں اور بڑے مدراسی رومال بہت تھے، جو ان کے ذوق لباس کی ترجمانی کرتے تھے،

بے دودھ کی چائے نہ صرف خود استعمال کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی پیش کرتے اور فرماتے کہ دودھ کے ملانے کے بعد چائے کہاں رہتی ہے، وہ تو دودھ ہو جاتی ہے، مولانا مرحوم کا نہ صرف ماتحتوں کے ساتھ مشفقانہ و مربیانہ برتاؤ تھا، بلکہ نجی ملازمین، باورچی اور خدمتگار پر بھی پدرانہ شفقت فرماتے تھے، اول دن سے ان کے دو ملازم تھے، ایک باورچی اور ایک خدمتگار جو ان کی آخری حیات تک رہے، مولانا ممدوح نے حج و زیارت کا سفر بڑے اہتمام سے کیا تھا، جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا، ان کی والہانہ کیفیت اور شوق و وارفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، مرحوم نے جدہ کے بعد واپسی تک جوتا نہ پہنا، ان کی اتباع میں ان کے رفقا خان بہادر زین الدین صاحب مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر اور یونیورسٹی ٹریزرر اور پروفیسر حمید الدین خاں صاحب مرحوم صدر شعبۂ فارسی یونیورسٹی بھی برہنہ پا رہے، ممدوح اپنے رب کی بارگاہ میں سراپائے "عبدیت" ہو کر حاضر ہوئے تھے، مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین پر انھوں نے جو صبح و شام گذارے ان کے رفقا، اس کے جو واقعات سناتے تھے، اس سے بارگاہ نبوی سے ان کے بے پایاں عظمت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے،

مولانا مرحوم کی بارگاہ میں شام کو عصر اور مغرب کے درمیان احباب کی نشست ہوا کرتی تھی، جس میں مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم اڈیٹر کانفرنس گزٹ، مولوی محمد مقتدی خاں شروانی مرحوم، نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم، ڈاکٹر کریم حیدر مرحوم، پروفیسر اقتصادیات، خان بہادر چودھری نبی احمد مرحوم، سید زین الدین صاحب مرحوم اور کبھی کبھی ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم اور پروفیسر

حمید الدین مرحوم بھی ہوتے تھے، میں بھی بحیثیت ایک جونیر کے حاضری دیتا تھا، اور جب
حاضری سے کسی وجہ سے قاصر رہتا تھا تو آدمی بھیجکر طلب فرماتے تھے، اس نشست میں اگر کسی
مسئلہ کو پیش کیا جاتا تو جواب ملتا کہ یہ ہماری گپ کا وقت ہے، مسائل وغیرہ کے اوقات دوسرے ہیں،

مولانا مرحوم حسب ذیل وائس چانسلروں اور پرو وائس چانسلروں کے ماتحت رہے
لیکن خودداری کو ٹھیس نہ آنے دی کبھی کسی کے یہاں حاضری نہیں دی بلکہ یہ حضرات خود
کبھی کبھی بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوتے تھے، اور مولانا حسب مرتبہ ان کی آؤبھگت فرماتے تھے۔

مہاراجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم، نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم،
سر شاہ سلیمان مرحوم جج ہائی کورٹ الہ آباد، یہ آپکے استاذ بھائی مولوی محمد عثمان وکیل
جونپور کے فرزند ارجمند تھے، اس لیے مولانا ان کے ماتحت ہونے کے باوجود ان کو اسی رشتہ
کی نظر سے دیکھتے تھے، اور سر سلیمان مرحوم حضرت ممدوح کا کافی احترام کرتے تھے، سر راس
مسعود مرحوم جو پہلے تنخواہ دار وائس چانسلر تھے، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم، مسٹر اس لوکھم،
مسٹر ہارڈن، ان میں صاحبزادہ آفتاب احمد مرحوم کے سوا جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز کا مسئلہ
کھڑا کر دیا تھا، باقی ہر وائس چانسلر سے تعلقات خوشگوار رہے،

حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے بھی بڑھکر کوئی خبطی نہ ہوگا
اسکے بعد اپنے لطائف بیان فرماتے ہوئے خود بھی حظ اٹھاتے اور میں بھی لطف لیتا،
فرمایا کہ ایک بار، ایک صاحب دوپہر کو جب میں سو رہا تھا کمرہ کے اندر چلے آئے (یہ گرمیوں
کا موسم تھا) اور السلام علیکم کہہ کے سونے کے کمرہ میں جو کرسی تھی اس پر بیٹھ گئے، ان کی آواز
سے آنکھ کھل گئی لیکن میں اوڑھے ہوئے لیٹا رہا اور سلام کا جواب اسی نیم خوابی کی حالت
میں دیدیا، انھوں نے فرمایا کہ میں نے جناب کو اپنی ایک تصنیف بھیجی تھی، میں نے بھی لیٹے لیٹے

جواب دیدیا کہ ہاں بھیجی ہوگی، فرمایا اس پر میں آپ کی رائے کا طلب گار ہوں جس کے لیے اب تک
منتظر رہا، میں نے جواب دیا، ہر کتاب پر رائے دینا ضروری نہیں ہے، یہ سنکر وہ اٹھے اور سلام
کرکے کہا آپکے علم و اخلاق کی شہرت سنی تھی، اخلاق تو دیکھ لیا، علم کا پھر کبھی امتحان ہو جائیگا،
یہ کہکر چلدیے، میں گھبرا کر اٹھا کہ کون صاحب ہیں اور اپنی لاپرواہی کی معذرت پیش کروں
مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا،

ایک مرتبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ایک بزرگ عالم حضرت مولانا شیر علی صاحب مرحوم
جو مولانا مرحوم کے جونپور میں رفیق درس رہ چکے تھے، تشریف لائے، جاڑوں کا موسم تھا،
حضرت کے مہمان تھے، سخت سردی تھی، ان کے رہنے کا انتظام کمرہ کے اندر کر دیا گیا تھا خود
حضرت مولانا جاڑوں میں بھی لحاف اوڑھکر برآمدہ میں سویا کرتے تھے، تہجد کے وقت حضرت مولانا
شیر علی صاحب اٹھے، دروازہ کھولا جس کی آواز سے مولانا کی آنکھ کھل گئی، نیم خوابی کی حالت
میں پوچھا کون؟ مہمان بزرگ نے اپنا نام لیا اور فرمایا "مولانا گرم پانی وضو کے لیے چاہیے"،
مولانا نے اسی نیم خوابی کی کیفیت میں لیٹے لیٹے جواب دیا کہ وہ تو رخ میں ہے، مہمان نے برجستہ
فرمایا بہتر ہے اٹھیے اور اس کا راستہ بتائیے، اس برجستہ جواب پر میں ہنس پڑا، اور میں نے کہا
کہ مولانا آپ نے اس برجستہ اور موزوں جواب سے ایک طرف تو مجھکو قائل کر دیا، دوسری طرف
میری نیند بھی اڑا دی،

مولانا مرحوم جاڑوں میں بھی سقاوے کا ٹھنڈا پانی وضو اور پینے کے لیے استعمال فرماتے
تھے اور گرمیوں میں پنکھا استعمال نہیں کرتے تھے، مگر میں نے یہ آخری قانون اس طرح سے توڑ دیا
کہ مولانا نے دس بارہ آدمیوں کی دعوت کی، میں ہی اس کا منتظم تھا، میں دہلی جاکر میز کا ایک پنکھا
جو کافی بڑا تھا اور استعمال کیا گیا تھا، خرید لایا، بڑے کمرہ میں دسترخوان بچھایا گیا تو میں نے ایک کونے میں

اسٹول پر دو پنکھا رکھ دیا جس نے تمام مہمانوں کو ہوا دی،

مولانا مرحوم جیسا کہ اوپر لکھا گیا، جاڑوں کے موسم میں بھی باہر کے برآمدہ میں سویا کرتے تھے، ایک روز رات کو کسی وقت بارش ہو گئی، بوچھاڑ کا پورا پانی پلنگ پر آیا، ممدوح فرماتے تھے کہ جب پانی کی ٹھنڈک پیٹھ میں لگی تو میں سمجھا کہ سانپ پلنگ پر چڑھ آیا، دفعتہً لحاف پھینک کر پلنگ کے نیچے کھڑا ہو گیا، تو دیکھتا ہوں کہ پانی پلنگ پر ہے، حد درجہ پشیمان ہوا۔

میں نے حضرت ممدوح کی پوری نو سال ماتحتی کی، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، ہمیشہ میرے طریق تدریس کو سراہا، ۱۹۳۳ء میں، میں ایک صاحب کے غلط اور گمراہ کن وعدوں کی بنا پر حیدرآباد کی خدمت پر آمادہ ہو گیا، چنانچہ میری درخواست پر صدر شعبہ کی سفارش پر اگزیکیٹو کونسل نے مجھے ایک سال کی رخصت بلا تنخواہ دیدی، اور میں حیدرآباد چلا گیا، اگرچہ مولانا مرحوم نے میرے حیدرآباد جانے کو ناپسند فرمایا، مگر میرے اصرار پر بہر حال مجھکو اجازت مرحمت فرما دی۔

وہاں جب ملکی اور غیر ملکی کے ہنگامہ نے سر اٹھایا تو میں نے علی گڑھ کی واپسی کا فیصلہ کر لیا اور مہاراجہ بہادر صدر اعظم حکومت کو استعفا پیش کر دیا، مولانا مرحوم و مغفور کو اپنے ارادہ سے مطلع کر دیا، مولانا نے جو تفصیلی خط مجھے بھیجا تھا، وہ انتہائی شفقت سے معمور تھا، انھوں نے میرے ارادہ کی توصیف فرمائی اور اسکے بعد تحریر فرمایا، "آپ نے مشورہ طلب فرمایا اور اپنے مخلصانہ اعتماد سے میری عزت افزائی فرمائی ہے، اظہار رائے پیش کرنا ضروری ہے، مولانا! نہ میں عاقل، نہ فرزانہ اور نہ آزمودہ کار، ہاں آپ ہی کے بزرگوں کے اپنے خوان فیض سے جو ریزے علوم شرعیہ کے مجھے عطا فرمائے ہیں، ایسے موقع پر اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ میری پختہ رائے ہے کہ آپ علی گڑھ تشریف لے آئیں.......... آپ جیسی

شخصیت اس وقت ہندوستان میں نادر الوجود ہے.......... بادل ناخواستہ میں آپکے حیدرآباد جانے پر یوں راضی ہوا تھا کہ آپ وہاں جا کر اپنے چند بیکار عزیزوں کیلیے کچھ شغل پیدا کر لیں گے، لیکن برس روز کا یہ نتیجہ ہے کہ ذہنی کوفت، مالی نقصان، وطن کی جدائی، احباب کی مفارقت، یہ سب ہے، مگر روپیہ مفقود،

آگے چل کر اپنے طبعی تعلق کو اس طرح سے ظاہر فرماتے ہیں "آپ کے تشریف لے جانے سے میرا بازو ٹوٹ گیا، میرے شعبہ میں روح نہیں ہے، ایک مخلص کرم فرما سے محروم ہو جانا بڑی مصیبت ہے.......... صحبت گذشتہ کا نوحہ اور ماتم، خدا کے لیے اب بھی سمجھ جائیے اور یہاں چلے آئیے" خط کو ختم کرنے سے پہلے بہار کے زلزلہ کا حال لکھتے ہوئے اپنے دولت کدہ کے نقصان کا بھی ذکر فرمایا، اور لکھا کہ زلزلہ نے تو دل پر اثر کیا ہی تھا کہ اسی عرصہ میں آج محمد امین صاحب زبیری نے سرفراز فرمایا، پانچ منٹ کی سرفرازی نے طبیعت کے اعتدال کو پامال کر دیا، اس لیے اگر کوئی لفظ یا جملہ نامناسب قلم سے نکل گیا ہو تو اسے معاف فرمائیے"۔

اس کے بعد میں نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا، اور مہاراجہ کشن بہادر صدر اعظم کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا، جیسے انھوں نے مشفقانہ انداز میں اطمینان دلا کر پیش گاہ خسروی میں میرے لیے فرمان حاصل کر لیا، افسوس ہے کہ میں حیدرآباد ہی میں تھا کہ حضرت مرحوم نے تھوڑے دنوں کی ناسازی مزاج کے بعد اسی مکان میں جس میں روز اول آکر مقیم ہوئے تھے، ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ کو انتقال فرمایا، حضرت مرحوم کی وفات کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صدیوں پہلے گذرنے والے علماء و مشائخ کی ساری خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا، حضرت یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے، قبر پر حسب ذیل کتبہ کندہ ہے، جواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا مصنفہ ہے:

سلیمان اشرف سراہلِ تقوی	بہ علم و عمل والہ دینِ اشرف
چو نفسش شنید آیۂ ارجعی را	بہ جنت شد از قربتِ حق مشرف
پسش از دلِ پاک حسرت نوشتہ	بہ جنات عدن سلیمان اشرف

قطعہ کے آخری شعر سے سال وفات نکلتا ہے، جس کے پہلے مصرع کے الفاظ "دل پاک" سے تخرجہ اس طرح سے کیا ہے کہ لفظ پاک کا الف گویا پاک کا "دل" ہے، عدد ایک کو دوسرے مصرع کے اعداد میں جوڑ دیا جائے تو باعتبار حساب جمل ۱۳۵۸ھ ہو جاتے ہیں، اگرچہ یہ تخرجہ ذرا دور از کار ہے لیکن ایک عالم کے قلم کا ہے اس لیے قابل تسلیم ہے۔

معارف کے گذشتہ سالوں کی مکمل فائل اور متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا اور ہزاروں محققانہ، علمی و ادبی و تاریخی و فقہی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، جو ۶۸ سال سے اپنی شاندار روایات کے ساتھ یکساں جاری ہے، اسکے مضمون نگاروں میں تلامذۂ شبلی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوظفر ندوی وغیرہ فضلائے ندوہ کے علاوہ ملک کے بلند پایہ اصحاب قلم و ارباب علم و دانش ہیں، جنکے تحقیقی مضامین، علمی مقالات و ادبی نگارشات سے اسکے صفحات مزین ہیں، کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے مشکل ہی سے اردو کا کوئی رسالہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے، اسکی شہرت ہندوستان سے گزر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی ہے، یورپ کے ہر ملک کے مستشرقین نے اسکے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات اور محققانہ معلومات کی داد دی ہے، اور جن مستشرقین نے اسلام و تاریخ اسلام پر جب جب بھی اعتراضات کیے، سید صاحب نے اسی کے صفحات میں انکے جوابات دیے۔ اس رسالہ کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے مکتبہ میں محفوظ ہے، جن صاحب کو اس بیش بہا علمی ذخیرہ کی ضرورت ہو، دفتر سے خط و کتابت کریں۔

منیجر

تعزیتی تجاویز اور خطوط

(۲)

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کی رحلت کے سلسلہ میں تعزیتی تجویزیں اور خطوط ابتک برابر موصول ہو رہے ہیں، ان کا فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے ہم معارف کے ذریعہ ان تمام اداروں، بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اس حادثۂ جانکاہ میں دارالمصنفین کے کارکنوں کے غم میں شریک ہوئے۔

(ص ۔ ع)

حسب ذیل اداروں کی طرف سے تعزیتی تجویزیں موصول ہوئی ہیں:۔

(۱) شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ (اس کے پرنسپل جناب شوکت سلطان صاحب اس حادثہ کے وقت لکھنؤ میں تھے، وہاں سے انھوں نے تعزیتی تار بھیجکر اظہار غم کیا) (۲) مدرسہ نسواں انٹر کالج اعظم گڈھ (۳) دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن اعظم گڈھ (۴) یوپی سنی وقف سنٹرل بورڈ لکھنؤ (۵) شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۶) شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (۷) جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی (۸) شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی (۹) اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ (۱۰) انجمن ترقی اردو بمبئی (۱۱) جمعیۃ الطلبہ جامعہ فیض عام مئو ضلع اعظم گڈھ (۱۲) انجمن نادیۃ الاتحاد الجدید طلبۂ دارالعلوم دیوبند (۱۳) مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور (۱۴) انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی (۱۵) انجمن ترقی اردو بنارس (۱۶) جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر

(۱۷) دار العلوم فاروقیہ کاکوری (۱۸) جامعہ فاروقیہ صبر حد جونپور (۱۹) ایران سوسائٹی کلکتہ
(۲۰) مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج - جونپور - (۲۱) شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڈھ۔

خطوط

راج بھون بھنیشور ۲۴ر جنوری ۱۹۷۵ء بذ رجعہ گورنر اڑیسہ

مکرمی صباح الدین صاحب ! تسلیم

کرم نامہ ملا، جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کے انتقال کی اطلاع سے بیحد صدمہ ہوا، صاحب ممدوح نہ صرف جید عالم، پرہیزگار اور خدا ترس بزرگ تھے، بلکہ آپ کی طرح انھوں نے بھی اپنی زندگی دار المصنفین کے لیے وقف کر دی تھی، ان کے انتقال سے ادارہ کو بڑا نقصان پہنچا، خداوند کریم آپ کو اور آپ کے رفقاے کار کو مزید تقویت بخشے، امید ہے کہ آپ اس سانحہ کو برداشت کرتے ہوئے دار المصنفین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقف ہو جائیں گے، تا کہ یہ تاریخی علمی ادارہ اپنی پرانی شان کے ساتھ چلتا رہے، اور جو حضرات اس سے تعلق رکھیں وہ نہ صرف علم کی خدمت کریں بلکہ ہندوستان کے اتحاد و یگانگت کی قوتوں کو اور زیادہ مستحکم کریں، اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اچھی اور قابل احترام روایات کو قائم رکھتے ہوئے ملک کی ترقی میں بھرپور حصہ لیں، یہی مقصد حضرت شبلی مرحوم اور حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم اور دیگر اکابر کا تھا، اس میں انسانیت کی بھی بہتری ہے۔ میری طرف سے تمام احباب اور پرنسپل صاحب شبلی کالج کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں۔ میری نیک تمنائیں اس ادارہ اور آپکے ساتھ انشاء اللہ ہمیشہ رہیں گی میں آپ سب احباب کی دعاؤں کا محتاج ہوں، امید کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔

اکبر علی خاں

راج بھون بمبئی - ۶ر جنوری ۱۹۷۵ء

مکرمی !

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر مجھکو شاق گذری، خدا اُن کو اپنے جوار رحمت میں لے، میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ اپنے نانا کے توسط سے مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے نیاز حاصل تھا، اور بچپن میں تو مولانا شبلی مرحوم کو بھی اپنے نانا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا اور کبھی کبھار انکی گود میں بیٹھنے کی عزت بھی حاصل ہوئی تھی،

علی یاور جنگ

شعبۂ تاریخ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - ۲۱ر جنوری ۱۹۷۵ء

برادر مکرم ! سلام مسنون

کرم نامہ ملا، کیا بتاؤں شاہ صاحب کی یاد دل سے بھلائی نہیں جاسکتی، ان کی وجہ سے ایک خلا سا محسوس ہونے لگا، بقول عرفی

تراچہ آگہی کہ مرا از غروب آفتاب چہ گنجہائے سعاوت زیان جاں آمد

آپ کی جو ذہنی اور قلبی کیفیت ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ "معارف" میں آپ کا مضمون کئی بار پڑھا، اس کے ایک ایک لفظ سے سوز دل کی بو آتی ہے، یقیناً آپ کے لیے یہ سخت آزمایش کا وقت ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

...... مجھے یقین ہے کہ آپ نہ صرف ان روایات کو قائم رکھیں گے بلکہ دار المصنفین آپکی سرپرستی میں مزید ترقی کرے گا، ایسے حادثہ میں رنج و غم بالکل فطری بات ہے، لیکن اس سے قوتِ عمل پر اثر نہیں پڑنا چاہیے، اب ان بزرگوں کی ارواح کو خوش اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ ادارہ کی ترقی کے لیے مزید جد و جہد کی جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب صلاحیتیں دی ہیں، بد دل نہ ہونا چاہئے،

اپنے کاموں میں لگ جائیے، اللہ مدد کرے گا۔

میں انشاء اللہ فروری میں دمشق چلا جاؤں گا، آپ سے امید ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

والسلام

آپ کا خلیق احمد نظامی

آبگہ۔ گیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

برادرم صباح الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم۔ اچانک شب میں شاہ معین مرحوم کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، ڈھائی بجے شب تک آنکھوں سے آنسو رواں رہے اور اپنی اور ان کی نوعمری سے اس عمر تک کی زندگی کے سارے مرقعے یکے بادیگرے آنکھوں کے سامنے آتے رہے، تقریباً پوری رات بیداری میں گذر گئی، میری ان کی باہم یگانگی میں بھی بے مثال یگانگی تھی، قلب آجتک بے چین ہے، اگر میں سفر کے قابل ہوتا تو میں آپ لوگوں کے پاس پہنچکر آپ کے غم میں شریک ہوتا، اتفاق سے بڑی دشواریوں کے بعد چند دن ہوئے بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا ہے اس وقت تک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے، میں تقریباً دو سال سے لکھنے پڑھنے اور کہیں آنے جانے سے معذور ہوں، تقریباً دو سال ہوئے پٹنہ گیا تھا، اس کے بعد ہی ہائی بلڈ پریشر کا اثر پڑا، کئی بار چکر کھا کر زمین پر گرا، ذیابیطس کا بھی سخت حملہ رہا، ان بیماریوں کی وجہ سے موتیابند کا آپریشن ممکن نہ تھا، اب آپریشن کرایا تھا، خیال تھا کہ سفر کے لائق ہونے کے بعد ہی میں اعظم گڈھ پہنچونگا، اب میں کیا کہوں کہ دل کی تمنا یہی تھی کہ میاں معین کے پاس چند دن ٹھہر کر گھل مل لیتا اور پھر آگے سفر کا قصد تھا، افسوس میری ان کی آخری ملاقات اسی جوبلی کے موقع پر رہی، انکی محبت اور یگانگی کی یاد اپنی جگہ رہ کر مختلف باتیں یاد دلاتی رہتی ہیں، اس وقت آنکھوں کے

سامنے ان سے آخری ملاقات کا وہ منظر ہے جب وہ ۱۲ بجے شب کو میرے لیے اپنے بغل میں دبائے ہوئے بستر میری قیام گاہ پر لائے، اس وقت تنہائی میں جو باتیں ہوئیں، وہ سب ایک ایک کرکے یاد آرہی ہیں اور مجھے تڑپا رہی ہیں، جتنے دنوں بھی اب میری زندگی ہے، وہ برابر مجھے یاد آتی رہیں گی، اور میں ان کے غم میں روتا رہوں گا،

اگر اللہ نے چاہا تو ڈیڑھ دو مہینے کے بعد میں سفر کے قابل ہو جاؤں گا، اور فوراً ہی اعظم گڈھ پہنچکر ان کی قبر پہ فاتحہ پڑھوں گا، اور آپ لوگوں سے ان کا ذکر خیر کرکے اپنے آپ کو تسکین دونگا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اور ان کے اعزہ واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور آپ کے دست و بازو کو تقویت دے کہ مرحوم کے انتقال سے جو بار گراں آپ پر آگیا ہے، اسکو خوش اسلوبی سے اب سنبھال سکیں،

والسلام

آپ لوگوں کا مخلص

ریاست علی ندوی

مجمع خوبیہا! سلام مسنون

میں آجکل مکہ مکرمہ میں ہوں، کل برادر عزیز مولانا سید عبد اللہ عباس ندوی سلمہٗ سے جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر ملی، جس سے سخت صدمہ اور افسوس ہوا، دار المصنفین میں وہی ایک پرانی شخصیت رہ گئی تھی جس سے ادارہ کو تقویت تھی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور آپ کو اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین۔

شاہ صاحب مرحوم ہی نے ماہ شوال میں جبکہ میں سفر حج کی نیت سے بمبئی آرہا تھا، انصاری صاحب کو بمبئی خط لکھا تھا کہ امان اللہ حج کے لیے جا رہے ہیں، بمبئی میں ان کو آپ اپنی یہاں ٹھہرائیں،

اور ہر طرح کا خیال رکھیں، چنانچہ انصاری صاحب نے اپنے مکان میں ہمیں اور ہمارے رفقاء کو ٹھہرایا اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ۔

اب آپ پر دار المصنفین کا بوجھ پڑ گیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے، اور دار المصنفین کو قائم رکھے اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین

محمد امان اللہ قادری پھلواروی

۱۴ ذی حجہ شنبہ ۱۳۹۴ھ از مکہ معظمہ

ٹونک، ۱۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

محترم! سلام مسنون

دو روز ہوئے آل انڈیا ریڈیو سے یہ الم ناک خبر سننے میں آئی کہ مدیر رسالہ معارف حضرت مولانا شاہ معین الدین ندوی اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا شاہ صاحب یادگار سلف تھے، ان کی وفات علمی و ادبی دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، علمی دنیا ان کی رحلت پر جتنا بھی غم کرے وہ بجا و درست ہے، ایسے گوہر نایاب اور ایسے بحر العلوم اب کہاں پیدا ہو سکتے ہیں، علم کی اس کساد بازاری میں علم و ادب کے ایسے بحر بیکراں کا جو مجمع علوم و فنون بھی ہو، اٹھ جانا ایک قیامت ہے، ایک ایسی مصیبت ہے بلکہ مصیبت کا ایک ایسا پہاڑ ہے جو اہل علم کے سروں پر گرا ہے، اور اس نے ان کی ہمتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے،

رسالہ معارف کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے علم و عرفان کی جو بارش کی اور جس طرح اس علمی رسالہ کو مرتب فرماتے رہے، اور اس کے قیمتی مضامین کے ذریعہ علمی دنیا کو جو رہنمائی دی، آج ان کی جدائی کے وقت ان کا احساس و اعتراف شدت سے ہو رہا ہے، اور انکی

کمی کو بری طرح محسوس کیا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات نے ایسا زبردست خلا پیدا کر دیا ہے جو صدیوں پر ہونا ممکن نہیں ہے،

وہ دار المصنفین کے سکریٹری و رفیق و روح رواں تھے، علامہ شبلی اور سید سلیمان کے دور کے دیکھنے والے تھے، انکی علمی مجلسوں کے رفیق و شریک تھے، اور بزرگوں کی صالح روایات کے امین و محافظ تھے، خود بھی ایک صاحب طرز انشا، پرداز، مورخ اور ادیب و عالم تھے، بے شمار خوبیوں اور صدہا صفات حسنہ کے وہ منبع و مرکز تھے، ان کی ذات خوبیوں ہی خوبیوں اور محاسن و محامد کا مجموعہ تھی، ایسی خوبیوں کے انسان کی وفات انسانیت کیلیے ایک بڑا حادثہ ہے،

مرحوم سے مجھے غائبانہ تعارف حاصل تھا اور خط و کتابت کا شرف بھی، وہ بڑی محبت اور خلوص کا اظہار فرمایا کرتے تھے،

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے ہماری طرف سے تعزیت مسنونہ پیش ہے۔

"دار العلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک" میں جو راجستھان کی ایک قدیم درسگاہ ہے اور حضرت علامہ حکیم سید برکات احمد کی علمی یادگار ہے، شاہ صاحب کی وفات پر جلسۂ تعزیت ہوا اور مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا، مرحوم کے پس ماندگان تک ہماری تعزیت پہنچا دیجئے۔ فقط والسلام

شریک غم منظور برکاتی و قاضی الاسلام

مدرسین دار العلوم خلیلیہ ٹونک

رضا لائبریری رامپور، ۱۸ دسمبر ۱۹۷۴ء

برادر مکرم! سلام مسنون

اخبار دعوت دہلی سے معلوم ہوا کہ شاہ معین الدین صاحب کا انتقال ہو گیا، اس قحط الرجال میں ان

جیسے عالم، صوفی اور خوش اخلاق مسلمان کی جدائی ملت کا بڑا نقصان ہے، کثر اللہ فینا امثالہ،

میں آپ اور ان کے دوسرے رفقاء کے لیے دست بدعا ہوں کہ آپ کے اس غم کا اچھا اجر عطا ہو، اور ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے آپ سب مل کر بھر دیں، آمین ثم آمین۔

تمام احباب کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسلام مع الاکرام

مخلص عرشی

نیو دہلی، ۱۴ دسمبر ۷۴ء

محب مکرم آداب و تسلیمات

ابھی ابھی ریڈیو سے شاہ معین الدین احمد مرحوم کی رحلت کی افسوسناک خبر سنی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کو اس ناگہانی حادثہ سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے، عمر بھر کا ساتھی چھوٹ گیا، آپ اس پر جتنا ماتم کریں کم ہے، اتنا لمبا عرصہ آپ ایک دوسرے کے دن رات کے رفیق رہے کہ یہ جدائی بہت شاق گذرتی ہوگی، دار المصنفین کا نیا انتظام کرنا پڑیگا، آپ تن تنہا اتنا بوجھ کہاں اٹھا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل ارزانی فرمائے، آمین۔

میری طرف سے مرحوم کے خاندان میں تعزیت کیجئے گا۔

دعا ہے کہ خدائے برتر ان سے عفو و کرم کا سلوک کرتے ہوئے اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

سری نگر۔ ۹ جنوری ۷۵ء

برادر محترم!

شاہ معین الدین صاحب کے انتقال کی اطلاع مجھے ۱۸ دسمبر کو حیدر آباد سے دہلی پہنچتے ہی مل گئی تھی

ایک محفل میں رشید حسن خاں نے یہ اطلاع دی، کیا بتاؤں کس قدر صدمہ ہوا لفظوں میں نہیں آسکتا ہے

فروغ شمع جواب ہی، رہیگا رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہو

میں آپ کے غم کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں، آپ کا زندگی بھر کا تعلق تھا، ہر روز کا، بلکہ ہر لمحے کا تعلق تھا، لیکن تعلق کتنا ہی گہرا اور پختہ کیوں نہ ہو، موت اس تعلق کو توڑ دیتی ہے۔ آپ ان باتوں کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں، اس قدر شدید صدمہ پر میں کیا حرف تسلی آپ کو لکھوں، میں خود اپنے آپ کو پرسے کا مستحق سمجھتا ہوں۔ اللہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جگن ناتھ آزاد

یو۔پی۔ اسٹیٹ آرکائیوز لکھنؤ۔ ۲۶ دسمبر ۷۴ء

ڈیر رحمان صاحب!

مجھکو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی غمناک وفات سے انتہائی صدمہ ہے، دعا ہے کہ اللہ ان کی روح کو شانتی بخشے۔ میں آپ کے اور ان کے رشتہ داروں کے غم میں شریک ہوں، ان کے خاندان کے سوگوار پسماندگان تک میرا تعزیتی پیغام پہنچا دیں، ہم سے ایک بڑا اسکالر جدا ہو گیا، علم کے لیے یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

آپ کا مخلص کے۔ پی سری واستوا

کلکتہ۔ ۱۸ دسمبر ۷۴ء

مکرمی سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب!

آج صبح "آزاد ہند" میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی اچانک غمناک موت کی خبر پڑھکر بہت ہی مغموم ہوں، اس صدمہ سے اتنا ملول ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے

جذبات کا اظہار کن الفاظ میں کروں، ہندوستان کے مسلمان بلکہ اسلام کا ایک بہت ہی شریف اور اعلیٰ اوصاف کی شخصیت سے محروم ہو گیا، ان کی خدمات جو انھوں نے اسلامی علوم وفنون اور کلچر کے سلسلہ میں کیں وہ اپنی جگہ پر لاجواب ہیں، پرانے کلچر کی اعلیٰ شخصیتیں رفتہ رفتہ ہم سے جدا ہو رہی ہیں، اور ان کی جدائی سے جو خلا پیدا ہو رہا ہے وہ پُر نہیں کیا جا سکتا، دار المصنفین اور خصوصاً آپ کے لیے تو یہ بیحد المناک حادثہ ہے، میری تعزیت ان کے خاندان کے سوگوار افراد تک پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنتِ نعیم میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کا مخلص خواجہ محمد یوسف

کلکتہ مدرسہ، کلکتہ، ۸ر جنوری ۱۹۷۵ء

مکرم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

سلام مسنون۔ مولانا شاہ معین الدین صاحب کے حادثہ کی اطلاع یہاں کے اخبارات نے کافی تاخیر سے شائع کی، جبکہ یو۔ پی میں بر وقت اور بہت تیزی سے پھیل گئی تھی، کلکتہ سے خود آپ کے بھی کافی تعلقات ہیں، پھر بھی یہاں اتنی تاخیر ہوئی۔ اور شاید اسی وجہ سے مجھے یہ خط لکھنے میں بھی کافی دیر ہو گئی۔

شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ تو دینی، علمی اور دانشوروں کے طبقے ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے ایک سانحہ عظیم ہے جس کو ناچار برداشت تو کر لیا گیا مگر اس کا اثر مدتوں تک قائم رہے گا، بلکہ اس سے بڑھکر بیرون ہند بھی شاہ صاحب کی علمی ادبی شخصیت کو مدتوں یاد رکھا جائے گا، لیکن آپ کے لیے اور آپ پر اس حادثہ کا جو اثر ہوا ہے وہ بالکل فطری امر تھا، میں نے جو کچھ سنا اگر اس کے خلاف کوئی بات ہوتی تو میرے لیے حیرت و

استعجاب کا سبب بنتی۔ اس کو ایسے ہی سمجھ لیجئے کہ پنڈت نہرو پر رفیع احمد قدوائی کے انتقال کی خبر سے چین میں جو اثر ہوا تھا بس کچھ اسی قسم کا آپ پر بھی اثر ہوا ہے، میرے اندازے میں حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم کے واقعہ کو اگر یاد دلاؤں تو بیجا نہ ہوگا، اس وقت آپ کی کیا کیفیت تھی، اور یقیناً آپ دار المصنفین سے مایوس ہو گئے ہوں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ادارہ کو باقی رکھا اور اچھی حالت میں رکھا بس اسی کو یاد کرکے آپ اپنے اس غم کو بھی برداشت کیجئے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے کسی مرد خدا کو ظاہر کریں گے، جو اس روشن چراغ کے لیے تیل کا کام دے گا۔ ذمہ داری کا جو بوجھ آپ پر ہے، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اس فکر میں آپ تنہا نہیں ہیں، دوسرے بھی کم و بیش آپ کے شریک غم و فکر ہیں۔ آپ اپنے ارد گرد سوگواروں اور فکرمندوں کا گروہ پائیں گے، کیا آپ کی تسلی اور صبر کے لیے یہ کافی نہیں ہیں، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرنا رسماً اور عادۃً تو ہے ہی، مگر اس سے بڑھکر ان کے طفیل میں خود اپنے لیے دعائے مغفرت ہوتی ہے، اسلیے دل سے ہر فرد دعا کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول فرمانے والے ہیں،

فقط والسلام شریکِ غم سوگوار محبوب الرحمن

اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۴ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

شاہ صاحب کے اچانک انتقال پر ملال سے دل و دماغ کا جو عالم ہے، اس کا احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے، اور خود آپ کا کیا حال ہوگا، اس کا تصور بھی دشوار ہے، مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارہ کار ہی کیا ہے، اور "کل من علیہا فان" کے ازلی قانون سے کسے مفر ہے۔ اس لیے خود صبر سے کام لیکر دوسروں کو صبر کی تلقین کیجئے، حالانکہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کلمات تعزیت آپ تک پہنچاؤں۔

عجیب اتفاق ہے کہ ۱۳؍دسمبر کو ہی دریا باد مولانا دریابادی کی خدمت میں ان کے کتب خانے کے یونیورسٹی کے لیے خریداری کے سلسلہ میں حاضر ہوا اور اسٹیشن پہنچنے پر وہ منظر یاد آیا جب وہاں سے مولانا موتمر علوم اسلامیہ کے اجلاس ششم میں شرکت کی غرض سے ساتھ ہو گئے تھے اور پھر اس اجلاس کا پورا منظر اور اس کے جلسوں اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں شاہ صاحب اور آپ کا انہماک یاد آگیا، جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد مولانا سے خود اس اجلاس کا ذکر آیا اور اس وقت بے اختیار دل اعظم گڈھ پہنچکر شاہ صاحب سے ملنے کا چاہا، اس لیے کہ آپ سے کچھ عرصہ قبل ملاقات ہو گئی تھی مگر شاہ صاحب سے عرصہ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، مگر کیا خبر تھی کہ اس وقت قضا و قدر اس ملاقات سے ابدی محرومی کا فیصلہ کر رہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آج یہاں پہنچا، تو شعبہ کے اساتذہ و طلبہ سے اس حادثہ کا ذکر ہوا، اور اسی کے بعد ان کا ایک مشترکہ جلسۂ تعزیت ہوا جس کی تجویز منسلک ہے، اور میں انہی اور اپنے رفقاء و طلبہ کی طرف سے بھی کلمات تعزیت پیش کر کے بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور مرحوم کے پس ماندگان و جملہ رفقائے دار المصنفین کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

شریک غم و غمزدہ اقبال انصاری

نئی سڑک، دہلی۔ ۲۱؍دسمبر ۷۵ء

محترم و مکرم! سلام مسنون

گرامی نامہ اور معارف کے اپریل و اکتوبر کے شمارے ملے، شکریہ کا خط لکھنے ہی والا تھا کہ اخبارات کے ذریعہ مشفق و محترم حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحب مرحوم کے انتقال کی افسوسناک خبر بجلی بن کر گری، ابھی معارف میں ان کے سفر حرمین شریفین کی روداد سے لطف اندوز ہو رہا تھا

کہ انکی جدائی کی خبر نے بجلی گرا دی، ابھی اس اندوہناک خبر سننے کے لیے دل تیار نہ تھا، مگر حکم ربی ... انا للہ۔ فوری طور پر انجمن تعمیر اردو کی طرف سے غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی میں تعزیتی جلسہ کیا گیا، جسکی صدارت عالیجناب کرنل بشیر حسن زیدی نے فرمائی، نیز ڈاکٹر یوسف حسین خاں، علی جواد زیدی، گلزار دہلوی، صالحہ عابد حسین، جسٹس ویاس دیو مصرا، ایس، ایچ۔ اے جعفری، ظفر مرادآبادی، عزیز وارثی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ذہین نقوی۔ نیز بہت سے شعراء، ادباء، صحافی اور دانشور حضرات نے شرکت فرما کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور دعائے مغفرت کی۔

میری جانب سے مولانا مرحوم کے اہل خاندان کی خدمات میں بعد سلام کے تعزیت پیش فرما دیں، خداوند قدوس مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، اور جوار خاص میں جگہ دے، آمین

والسلام قمر سنبھلی

مومن پورہ، ناگپور۔ ۱۸؍دسمبر ۷۵ء

مکرم! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، کل کے روزنامہ دعوت دہلی میں یہ خبر دیکھی کہ شاہ معین الدین صاحب ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر کو پڑھ کر میرے دل پر جو کچھ گذری وہ بیان نہیں کر سکتا، اور آج جبکہ یہ خط لکھ رہا ہوں تو میری آنکھیں اشکبار ہیں، گذشتہ پانچ سالوں میں مرحوم کے بہت ہی قریب ہو گیا تھا، اور معارف میں میرے کلام کی اشاعت ان ہی کی مرہون منت اور محبت کا نتیجہ تھی، موصوف سراپا اخلاق و کردار اور مجسم خلیق انسان تھے، انکی ذات مجمع الفنون تھی، لہذا اگر یہ کہا جائے کہ شاہ صاحب کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے، تو بے جا نہ ہوگا، دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائے، نیز انکے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا ÷ کہاں ہو آج تو اے آفتاب نیم شبی

غم خوار محمد شرف الدین ناگپور

ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۴ء

محب محترم و مکرم زاد مجدکم ، السلام علیکم ۔ حضرت مولانا الحاج شاہ معین الدین اللہ کے یہاں تشریف لے گئے، ہم سب اپنے وقت پر وہیں جائیں گے، مبارکباد کے مستحق وہ بندے ہیں جو وہاں جانے کی تیاری کرلیا کرتے ہیں، شاہ صاحب ان ہی میں سے تھے۔

اس دنیا کا کام کس نے پورا کیا ہو کہ شاہ صاحب کرلیتے، ان کے کاموں کی تکمیل انشاء اللہ آپ کے ہاتھوں ہوگی، آپ شاہ صاحب کے پرانے رفیق ہیں، اللہ سے دعا ہے کہ آپ رفاقت کا حق ادا کریں گے۔ مسند علم سونی ہوگئی اور خالی بھی ہوگئی۔ اس کے پہلے بھی بارہا ایسا ہوا ہے، مگر اللہ نے ہمیشہ کسی نہ کسی کو منتخب فرمایا ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشریف لیجانے کے بعد لوگوں نے دارالمصنفین کا فاتحہ پڑھ لیا تھا، مگر اللہ نے دکھا دیا کہ یہ ادارہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ نہ معلوم کتنوں کو زندۂ جاوید کرنے والا ہے،

شاہ صاحب تو اچھے تھے، انشاء اللہ جنت میں اچھوں کے ساتھ ہوں گے،

میں نے چودھری اویس احمد سلمہ سے تعزیت کی ہے، وہ میری طرف سے اپنی والدہ اور عزیزی داؤد احمد سلمہ سے تعزیت کرلیں گے۔

دارالمصنفین سے بھی تعزیت لازم ہے، تو آپ کا یہ نیازمند آپ کے ذریعہ یہ فرض پورا کررہا ہے، مجھے خوب معلوم ہے کہ شاہ صاحب مرحوم آپ کے ساتھ بہت محبت فرماتے تھے، اور ہمیشہ آپ پر اعتماد کرتے تھے، براہ کرم میری دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ اللہ کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ والسلام

ہاشم

جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۴ء

محترمی ! السلام علیکم

رات سوا نو بجے کی اردو خبروں میں ریڈیو نے جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی وفات کی خبر سنائی، انا للہ۔ شاہ صاحب کی علالت کی اطلاع پہلے سے کوئی نہیں تھی، اس لیے اس خبر سے سخت تعجب ہوا، اس حادثہ کی وجہ سے آپ پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ بڑی حد تک ہے، ذرا مطلع کرکے ممنون فرمایئے کہ کب بیمار ہوئے، کیا بیمار ہوئے، کس وقت انتقال ہوا، مجھے جلد معلوم کرنے کی بےچینی ہے، اگر آپ اس وقت خود نہ لکھ سکیں تو براہ کرم مولوی ضیاء الدین صاحب سے کہہ دیجئے وہ لکھ دیں۔

شاہ صاحب کی وفات پر دارالمصنفین کے مستقبل کے بارہ میں فکرمند ہونا لازمی ہے، مگر اس سے زیادہ اس وقت آپ کی فکر ہے، دارالمصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر آپ کی رقت قلبی کا جو مشاہدہ ہوا تھا، اس کی وجہ سے بار بار خیال آتا ہے کہ نہ جانے آپ پر کیا گذری ہوگی، آپ کا کیا حال ہوگا، مگر جس طرح آپ نے دوسرے رفقائے دارالمصنفین کے غم برداشت کیے ہیں اور ان کی جدائی کے بعد ذمہ داریوں میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھایا ہے، اسی طرح اس موقع پر بھی صبر و ضبط کا ثبوت دیں گے۔ اور اب جبکہ دارالمصنفین کی تمام ذمہ داریاں تنہا آپ کے کاندھے پر آپڑی ہیں، مجھے امید ہے کہ اس سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کریں گے، مجھ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں آپ پر، آپ کی صلاحیتوں اور آپ کے خلوص پر پورا بھروسہ اور دارالمصنفین سے محبت اور لگاؤ ہے، خدا سے دعا ہے کہ آپ میں صبر و ضبط اور اس اہم ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دینے کی طاقت اور ہمت پیدا کرے، آمین۔

آپ کا نیازمند : عبداللطیف اعظمی

(باقی)

ادبیات

شاہ صاحب کی وفات پر بہت سی تعزیتی نظمیں بھی موصول ہوئیں جن میں کچھ تو شائع کیجا رہی ہیں اور جگہ کی قلت کی وجہ سے کچھ کے صرف چند اشعار لیے گئے ہیں۔ (ص - ع)

آہ مولانا شاہ معین الدین احمدؒ

از جناب پروفیسر نکہت شاہجہانپوری

کرم فرمائے نکہت شاہ مولانا معین الدین
جمیل آمد بہ جنت شاہ مولانا معین الدین

ہماں نازِ سلیمانؒ فخرِ شبلیؒ جان محبوبی
ادب آموز ملت شاہ مولانا معین الدین

معارف ہا از و گلشن، فضائل ہا از و روشن
مثیلِ ابر رحمت شاہ مولانا معین الدین

تجلیاتِ احمدؐ با احد در سیر تش پنہاں
سراپا نور وحدت شاہ مولانا معین الدین

چو خوش اسمے کہ دارد با مسمیٰ ہم نوائی ہا
زہے حسنِ سعادت شاہ مولانا معین الدین

بہ کردار و بہ گفتار و بہ علم و فضل دل آرا
مجسم حسن سیرت شاہ مولانا معین الدین

چرا نازد نہ ہندوستاں بذات و کمال او
خوشا سرکار عظمت شاہ مولانا معین الدین

ہمہ گلہائے فن و علم بینی از کہ خندہ زن؟
ز فردوسی بصیرت شاہ مولانا معین الدین

بہ خلوت انجمن آرا بہ جلوت نازش دلہا
زسرتاپا محبت شاہ مولانا معین الدین

بصیرت کار و دور اندیش صلح و آشتی پرور
زہے نباض فطرت شاہ مولانا معین الدین

ہمہ عمرش ہمہ آزاد از نمود و زعم عمامہ
شرف بخش فضیلت شاہ مولانا معین الدین

یکایک چشم بربستہ ز اعظم گڈھ کہ جانش بود
چرا ایں جورِ[1] عجلت شاہ مولانا معین الدین

تو ئی تسکین قلب ما تو ئی تزئین بزم ما
بیا دیگر برافت شاہ مولانا معین الدین

ہمہ گریاں، تپاں، از درد ہجرت اشکباری ہا
کجائی جان ملت شاہ مولانا معین الدین

بفرما از کجا جوئیم حل عقدۂ مشکل
کہ دارد حسن فطرت شاہ مولانا معین الدین

خدا حافظ "بہ شکر و صبر" و امید بر شیریں
سلام صد تحیت شاہ مولانا معین الدین

ممات "مرد مومن" ہم حیات نو بنو دارد
زہے آغوش رحمت شاہ مولانا معین الدین

بہ احساس جزائے شکر و احساں فاتحہ بر خواں
بہ روح پاک حضرت شاہ مولانا معین الدین

سر آہم، دہد سر سالِ وفات مخلصم نکہت
"طہیر بحر رحمت" شاہ مولانا معین الدین

۱۹۷۵ = ۱ + ۱۹۷۴ء

تاریخ وفات

از جناب قمر سنبھلی دہلی

وہ معینِ حق آگاہ صاحب نظر
ذات تھی جنکی سب کے لیے محترم

وہ جہانِ صحافت کے بدرِ منیر
فخرِ علم و ہنر آبروے قلم

پاک طینت، فرشتہ صفت، نیک خو
ہیچ تھے سامنے جنکے جاہ و حشم

صاحبِ علم و دانش، حلیم و ذکی
ان کے اوصاف کیا ہو سکینگے رقم

اپنے احباب سے آہ منہ موڑ کر
یک بیک چلدیے سوئے ملکِ عدم

ہر طرف آج ہے شورِ ماتم بپا
ہے مدیر معارف کا سب کو الم

قلب خوں بن کے آنکھوں سے بہنے لگا
دل پہ ایسی پڑی حیف مضراب غم

مصرعِ سال رحلت قمر نے کہا
"ہائے وہ چلدیے سوئے باغِ ارم"

۱۳۹۴ھ

[1] جور در فارسی جدید بجائے طور راست و ہم معنی ظلم اینجا ہر دو درست

مرثیۂ شاہ صاحب

از
جناب ساحل صاحب بمبئی

پختہ کار و نکتہ سنج و قدر داں جاتا رہا
قافلے والو! امیر کارواں جاتا رہا

اب معارف کے ورق پر نور برسائیگا کون؟
معتبر فنِ صحافت کا نشاں جاتا رہا

اب حرم کا نغمۂ انسانیت چھیڑیگا کون
دینِ رحمت کے متن کا ترجماں جاتا رہا

جس نے لکھی تھی سلیماں کی حیاتِ جاوداں
مکتبِ شبلی کا وہ روحِ رواں جاتا رہا

وہ کریم النفس، فخرِ آدمیت اب کہاں
وہ خلیق و دلنواز و مہرباں جاتا رہا

ہے دعا ساحل کی اس پر رحمتِ باری رہے
اس کے فیضِ علم کا اک سلسلہ جاری رہے

قطعاتِ تاریخ وفات

از جناب حاذق ضیائی سہرامی

روحِ حاذق آج تو بے چین ہے
باغِ رضواں میں ملی تم کو پناہ

آہ میں پوشیدہ ہے تاریخِ وفات
عاقل و فاضل معین الدین آہ

۱۳۹۴ھ

دیگر

وہ معین الدین جو تھا اک مدیرِ بے مثال
دے گیا اپنی جدائی کا ہزاروں دل پہ داغ

بزمِ شبلی میں تھی حاذق نور ہی جسکی ضیا
تیرہ سو چورانوے میں بجھ گیا وہ بھی چراغ

۱۳۹۴ھ

نذرانۂ عقیدت

از جناب احمد مکرم عارفؔ بنارس

اے آفتاب مغرب! اے ماہتاب فانی
اُف، رحلتِ معین پر تری مٹ گئی جوانی

دار المصنفین سے رحلت کیا ارم کو
فردوس میں مکاں ہے، ہیں خلد آشیانی

عالم تھے باعمل وہ، سالک بھی بے بدل تھے
تاریخ اور ادب میں کوئی نہیں تھا ثانی

دار المصنفین کیا، دار المعلمین کی
دار المورخین کی کرتے تھے پاسبانی

آنکھوں سے اشک غائب گم ہوگیا ہے موتی
خوں رو رہا ہے عالم، زہرآب ہوا ہے پانی

سارا زمانہ غمگیں، ساری زمین غمگیں
احمر شفق افق پہ غم سے ہے آسمانی

ہے آئینۂ معارف شاہد نگارش [illegible]
شاہ معین کی دنیا اور دیں کی کامرانی

لب پہ درود، دل میں تقویٰ کی شان پیاری
چہرہ قمر تھا جس سے روشن تھی شادمانی

ہاتف نے دی صدائے تاریخ سال رحلت
عارفؔ معیں مکیں ہیں اب خلد آشیانی

۱۳۹۴ھ

ماتم شاہ صاحب

از جناب یحییٰ حنفی

رُدولی میں کبھی چمکی جو عبدالحی کے چہرے پر
وہی تھی عارض روشن میں اسکے روشنی کل تک

عطا کی تھی جسے معصوم فطرت دست قدرت نے
معارف کے لیے تھی وقف جسکی آگہی کل تک

ہے برپا شور ماتم آج میت دیکھکر اسکی
وہ جس کی زندگی اخلاص کی تصویر تھی کل تک

جہانِ علم و دانش میں یہ ماتم کا مقام آیا
اٹھی میراث سید بزم شبلی میں جو تھی کل تک

قطعۂ تاریخ

از

جناب رحمت الٰہی برقؔ صاحب صدیقی اعظمی

فخر ہندوستاں معین الدینؒ
فاضلِ کامل و وسیع نظر

نازشِ دودمانِ عبدالحیؒ
صلح کل، نیک خو، بلند اختر

روحِ دارالمصنفین شہیر
مردِ عالی وقار و دانشور

تنگ آمد چو از غمِ ہستی
سوئے دار السلام کرد سفر

مرغِ جانش بجنت الفردوس
کرد پرواز چوں نسیمِ سحر

جملہ احبابِ شبلی منزل حیف
در فراقش شدند خستہ جگر

خامۂ برقؔ زد رقم تاریخ
از جہاں رفت عالم اشہر
۸ ۵۹ ۶۸۰ ۱۴۱ ۵۰۶
۱۳۹۴ھ

نالۂ غم

از جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپور

تصنیف کا امام قلم کا وہ شہسوار
صد حیف جانشینِ سلیمانؒ چلا گیا

دانش کدے میں نور تھا اسکے وجود سے
فہم و خرد کا مہر درخشاں چلا گیا

وہ دین کا معین وہ ملت کا پاسباں
علم و ادب کا نیرِ تاباں چلا گیا

برزخ کے لوگ جھوم رہے ہیں سرور میں
یہ کون سوئے گورِ غریباں چلا گیا

عثمانؔ سب کو چھوڑ کے مغموم و غمزدہ
گلشن سے کون جانِ بہاراں چلا گیا

مطبوعات جدیدہ

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمدؒ مرتبہ جناب مولوی مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۴ مجلد، قیمت ۱۵ روپئے۔

پتے: (۱) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈویژن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) فرنگی محل کتاب گھر، ۹۔ فرنگی محل لکھنؤ (۳) صدق بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔

تقریباً ڈھائی سو سال سے ہندوستان میں ملا نظام الدینؒ، اور ان کے درس نظامیہ کا غلغلہ بلند ہے، ان کی اہمیت و عظمت کی بنا پر علامہ شبلی مرحوم نے ان پر اور درس نظامیہ پر دو بیش قیمت مقالے تحریر فرمائے تھے لیکن ابھی تک ملا صاحب کی ایک مبسوط سوانحعمری کی ضرورت باقی تھی، زیر نظر کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، اس کا زیادہ حصہ چند سال پہلے معارف میں چھپ چکا ہے، اب آخر میں مزید اضافہ کرکے اسے کتابی صورت میں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں پہلے ملا نظام الدین کے والد بزرگوار ملا قطب الدین سہالوی کی شہادت اور اس کے بعد انکے پسماندگان کے ترک وطن کرکے لکھنؤ میں آباد ہونے کی روداد اور اسی ضمن میں ان کے خاندان اور تعلیم وغیرہ کا ذکر ہے، پھر ملا نظام الدین کی سیرت و سوانح اور فضل و کمال کی تفصیل کے علاوہ ان کے درس و تدریس، تصنیفات، وفات، مزار، قیام گاہ، درسگاہ، اولاد، اور تلامذہ کے بارہ میں مفصل معلومات فراہم کیے گئے ہیں، ایک باب میں ان کے پیر و مرشد شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کا بھی موثر تذکرہ ہے، آخر میں درس نظامی کی خصوصیات اور اس کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے،

لکھنؤ اور فرنگی محل کی وجہ تسمیہ پر بھی مختصر گفتگو کی گئی ہے۔

لائق مصنف نے اپنے خاندان کی محفوظ دستاویزوں، قدیم یادداشتوں اور مخطوطات کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے یہ کتاب سلیقہ سے مرتب کی ہے، واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے، لیکن اس کی وجہ سے کہیں کہیں تکرار اور بیجا طوالت ہوگئی ہے، ملا صاحب کے صاحبزادے ملا عبد العلی بحر العلوم کا ذکر تلامذہ اور اولاد دونوں میں کیا گیا ہے، بعض جگہ بحث و مناظرہ کا رنگ بھی آگیا ہے، درس نظامی میں علوم شرعیہ کی جانب قلتِ اعتنا اور معقولات کیجانب شدتِ اعتنا کی شکایت صرف حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ہی کو نہیں ہے بلکہ یہ تو اس پر ایک عام اعتراض ہے، جیسا کہ خود مصنف نے بھی ص ۲۵۹ پر لکھا ہے، مگر انھوں نے اس کا الزامی جواب ہی دینے پر زیادہ اکتفا کیا ہے، صحاح ستہ کے دورہ کے مفید نہ ہونے سے حدیث کو نظر انداز کرنے کی گنجایش تو نہیں نکلتی، عام انسانی کوششوں کی طرح اگر درس نظامیہ میں بھی کچھ خامیاں ہوں تو ان کی تاویل کی کیا ضرورت؟ ان سے اس کی شہرت اور خوبیاں کم نہیں ہوسکتیں، مصنف نے تفسیر اور حدیث کے سلسلہ میں علمائے فرنگی محل کے جو خدمات گنائے ہیں ان کا ذکر خود سید صاحب کے مقالہ میں بھی موجود ہے، ص ۱۶۷ کے حاشیہ میں لکھا گیا ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ "یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ" کے ورد کے جواز کے قائل تھے، مگر ان بزرگوں کی تحریروں کے اقتباسات نہیں دیے گئے ہیں، مصنف کا خود جاہے جو خیال بھی ہو لیکن ارباب ظاہر کے نزدیک تو شائبۂ شرک سے بھی پرہیز لازم ہے، ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب محنت و جانفشانی سے لکھی گئی ہے، لائق مصنف ملا صاحب ہی کے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، اسلیے انھوں نے انکی سوانحعمری کا حق ادا کر دیا ہے، اور اس کے لیے وہ مشرقی علوم کے قدر دانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، کتاب کے آخر میں اسماء و اعلام کے مفصل اشاریے اور مآخذ کی فہرست اور جابجا شاہی فرامین اور ملا صاحب کے بعض خطوط کی اصل اور بعض کی نقل کے عکس بھی دیے گئے ہیں، اس سے اسکی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

(۱) النفط او البترول والشرق
(۲) فلسفۃ غاندی الاقتصادیۃ

مرتبہ سید ابو النصر احمد الحسینی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات (۱) ۸۴ و (۲) ۴۸ قیمت بالترتیب ۱۵ و ۱۰ شلنگ۔ پتہ: مصنف سے بشارع الازہر رقم ۳ - دار محمد بک ابی الذہب القاہرہ (مصر)

اس وقت پٹرول اکثر صنعتی ملکوں کی اہم ضرورت بنگیا ہے، پہلی کتاب میں عرب ملکوں کی اس خاص اور بیش قیمت پیداوار کے متعلق اس غلط فہمی کی تردید کی گئی ہے کہ مشرقی اور عربی ممالک اسکی قدر و قیمت اور طریقہ استعمال سے ناواقف تھے، اور اس کے بارہ میں یہ انکشافات مغربی ملکوں نے کیا، اس میں بعض دلائل اور تاریخی حوالوں سے یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب ممالک ایندھن، مجرمین کو سزا دینے، لڑائی کے اسلحہ اور دواؤں وغیرہ میں اسکو استعمال کرتے اور اسکے چشموں سے تجارتی اور مادی فائدے حاصل کرتے تھے، اس سلسلہ میں عربی شعر و ادب میں پٹرول کے ہم معنی لفظ "نفط" اور اسکے قریب المعنی دوسرے الفاظ بھی تحریر کیے گئے ہیں، مصنف کے خیال میں پانچ صدی قبل مسیح سے یہ لفظ مروج ہے، آخر میں مشرق بعید کے ملکوں، ہندوستان، انڈونیشیا اور چین کے پٹرول سے فائدہ اٹھانے کا ذکر کیا گیا ہے، لائق مصنف نے پٹرول کی طرح بارود کے انکشاف میں بھی مغرب کے بجائے ایک مشرقی ملک چین کی اولیت کو دکھانے کی کوشش کی ہے، گو یہ صحیح ہے کہ اہل مشرق پٹرول کی منفعت اور استعمال سے یک گونہ واقف تھے، تاہم معاشرتی و تمدنی ضرورتوں اور وسائل کی کمی کی بنا پر اسکا استعمال محدود تھا، یورپ نے صنعت و حرفت میں اسکے استعمال کو فروغ دیکر جس قدر ناگزیر بنا دیا ہے اور اس کے معدنی چشموں کی دریافت اور ان سے اسکی برآمد کو جتنا آسان کر دیا ہے، اس سے انکار مشکل ہے۔

دوسری کتاب، مصریوں کو گاندھی جی کے معاشی اصول سے واقف کرانے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ وہ اصلاً ایک اخلاقی و روحانی شخص تھے، اسلیے انکے دوسرے افکار کی طرح معاشی تصورات میں بھی اخلاقی عنصر نمایاں ہے، اس ضمن میں مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت سے گاندھی جی کے معاشی

نظریے کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے، شروع میں گاندھی جی کے حالات وسوانح اور قومی و سیاسی جدوجہد کا مختصر خاکہ بھی درج ہے۔

نغمۂ شب - از جناب اختر بستوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۹۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲ روپیہ - پتہ: شب خوں کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد۔

جناب اختر بستوی ایک نوجوان شاعر ہیں، زیر نظر مجموعہ انکی ایک طویل موثر نظم ہے، اس میں انھوں نے رات کے سناٹے میں اس سے اپنے ہمکلام ہو کر اس کے نغمے سننے کا ذکر کیا ہے، اسکے تین حصوں میں زندگی کے صدمات اور تلخیوں، موت کی بے رحمی اور موجودہ حالات کی داستان، زندگی کے کرب و بیچینی اور سماج کی ناہمواریوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے، بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین یہ نظم اقبال کی "خضر راہ" کی یاد دلاتی ہے، مگر اختر صاحب ابھی نوجوان ہیں، انکو شاعرانہ لطافت و رنگینی، تخیل کی بلندی، سلاست و روانی اور طرز ادا کی دلکشی وغیرہ کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کلام میں مزید پختگی اور نکھار پیدا ہو۔

"ض"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین
نام پبلشر	"
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین۔ اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

جلد ۱۱۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق مارچ ۱۹۷۵ء عدد ۳

مضامین

تصحیح

معارف ماہ فروری ۷۵ء کے مضمون ہندوستان کی مذہبی رواداری میں ص ۹۰ سطر ۱۹ میں لفظ "شوور" غلط چھپ گیا ہے، صحیح سوار ہے۔

"ص-ع"